پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کے ابتدائی جانثار

رفیقانِ صدق وصفا

اعز عزیزی

بہت دنوں تک حسن ناصر کے رابطہ کار اور کوریئر جیسی اہم ذمہ داری بھی ادا کی تھی۔ جو اپنی نوعیت اہمیت اور حساسیت کے اعتبار سے نہایت نازک اور خطرناک کام تھا کہ اس میں نہ صرف آپ کو اپنی ذات کے خول سے نکل کر شدید قسم کے ڈسپلن کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ راز داری کی بھاری صلیب اُٹھا کر اعتبار کے پل صراط کا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ خیال و عمل کی ایسی میکانکیت پیدا کرنا ہوتی ہے، جہاں معمولی قسم کے تساہل اور بھول چوک کی بھی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس ذمہ داری کو قبول کر کے آپ ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک تنظیمی سیٹ اپ کی سلامتی کی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔ حسن ناصر کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ وہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے بنیادی اراکین میں شامل تھے اور جنھیں قیام پاکستان کے بعد کراچی اور سندھ میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل تنظیم کی اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ حیدر آباد میں مخدوم محی الدین، ڈاکٹر راج بہار گوڑ اور، علی جواد رضوی وغیرہ کے ساتھ کام کر چکے تھے اور بمبئی میں ڈاکٹر ادھیکاری کی روپوشی کے زمانے میں ان کے کوریئر رہ چکے تھے۔

سیّد مظہر جمیل

اعز عزیزی صاحب کی زیرِ نظر کتاب پاکستان میں بائیں بازو کی چند شخصیات کے تذکرے پر مشتمل ہے، ان شخصیات میں کارکن اور رہنما دونوں شامل ہیں۔ جو خاکے لکھے گئے ہیں، ان میں سے کچھ مختصر اور کچھ نسبتاً طویل ہیں۔ اعز عزیزی صاحب کی کوشش یہ نظر آتی ہے کہ وہ جن لوگوں کے تذکرے کو ضروری سمجھتے ہیں ان میں سے کوئی نظر انداز نہ ہو خواہ ان میں سے کچھ کے بارے میں مختصر ہی لکھ پائیں۔

اعز عزیزی صاحب خود بھی بائیں بازو کی جدوجہد میں شامل رہے ہیں اور انہوں نے بساط بھر اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ ان کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے بھی تھا جو محنت کشوں کی تحریکوں میں سرگرم حصہ لیتا رہا۔ اعز عزیزی صاحب کی نظریاتی وابستگی جس نے ان کو ہمیشہ عملاً متحرک رکھا، اس کتاب کی تحریر کا بھی موجب بنی۔ پاکستان میں بائیں بازو پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مشاہدات و تاثرات کی شکل میں ایسے مواد کے طور پر بہم ہوگی جس کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگا۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد

رفیقانِ صدق وصفا

پاکستان میں کمیونسٹ تحریک کے ابتدائی جانثار

رفیقانِ صدق وصفا

اعز عزیزی

سانجھ

رفیقانِ صدق و صفا   خاکے   اعز عزیزی

اشاعتِ اوّل : 2016ء
قیمت : 400

Rafiqan-e-Sidq-o-Safa
(Profiles by Aez Azizi)

Printed by:
Naveed Hafeez Printing Press, Lahore, Pakistan

Price:
In Pakistan: Rs. 400.00

Published by:

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-201-8

والدہ زبیدہ بیگم

والد سیّد عزیز الدین احمد شاہ صوفی

اور

اپنی شریک حیات

اسما عزیزی

کے نام

فہرست

حصہ سوئم

اعز عزیزی......ایک تعارف

چند تأثرات

دنیا میں فکری انقلابات تسلسل کے ساتھ رونما ہوتے رہے ہیں اور ان کے نتیجے میں انسانی معاشروں میں غیر معمولی تبدیلیاں بھی آتی رہی ہیں۔ انیسویں صدی میں نوآبادیاتی نظام کی چیرہ دستیوں نے بعض امور پر از سرِ نو غور کرنے پر مختلف مفکروں کو مائل کیا۔ ڈارون، کارل مارکس، اینگلز اور سگمنڈ فرائیڈ اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتے ہیں پھر بیسویں صدی میں آئین اسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے کائنات شناسی کے نئے در وا کر دیے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس نے ہمہ گیر اثرات مرتب کیے۔ اس انقلاب کا خیر مقدم علامہ اقبال نے اس طرح کیا۔

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

پھر اقبال کے اس طرح کے اشعار بھی ایک خاص انقلابی جہت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

ان افکار سے اندازہ ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں ناانصافی، عدم مساوات، بھوک، افلاس، جہالت، جنگ، تخریب کاری جیسی منفی قوتوں کا مقابلہ کرنے اور انہیں شکست دینے کے لیے کسی انقلابی فلسفے اور اس پر عمل کرنے والوں کی تعلیمات پر ہی توجہ دینی ہوگی۔

برصغیر پاک و ہند میں ترقی پسند انقلابی فکر کو عام کرنے والوں میں کئی اہم نام آتے ہیں۔ سر سید احمد خان، علامہ اقبال، برکت اللہ بھوپالی، عبید اللہ سندھی، مولانا حسرت موہانی۔ ان کے علاوہ ادب و شعر سے تعلق رکھنے والی مزید شخصیتیں جوش ملیح آبادی، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، سردار جعفری نے بھی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ عملی میدان میں دادا فیروز الدین منصور، سجاد ظہیر، حسن ناصر، اعزاز نذیر اور ان کے ساتھیوں نے تاریخ ساز کارنامے سرانجام دیے۔ یہ تو چند اہم نام ہیں لیکن ایک پورا عہد ہے جس پر لکھنے کی ضرورت ہے۔

حال ہی میں بائیں بازو کی سیاست، پاکستان کی صورتِ حال اور ترقی پسند شخصیات کی جدوجہد پر انگریزی اور اردو میں چند اہم کتابیں آئی ہیں۔ میں انتہائی مسرت کے ساتھ جناب اعز عزیزی کی زیرِ نظر کتاب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس کتاب میں کئی اہم ترقی پسند شخصیات کا تذکرہ نظریاتی تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم سجاد ظہیر، حسن ناصر اور اعزاز نذیر کے بارے میں زیادہ تفصیلی مواد ملتا ہے۔ ان شخصیات سے اعز عزیزی کے ذاتی مراسم بھی تھے اور وہ ان کی انقلابی جدوجہد میں شریک بھی رہے۔ اس لیے بعض ایسی ذاتی باتیں اور واقعات جو پہلے منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ اعز عزیزی کی اس کتاب سے روشنی میں آئے ہیں۔

اعز عزیزی کا طرزِ تحریر رواں، شگفتہ اور موضوع کے عین مطابق ہے۔ یہ کتاب ایک عہد کے ترقی پسند رجحانات کی دستاویز بن گئی ہے جس سے مسلسل استفادے کی صورت پیدا ہوتی رہے گی۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

سحر انصاری

ایک قابلِ قدر خدمت

اعز عزیزی صاحب کی زیرِ نظر کتاب پاکستان میں بائیں بازو کی چند شخصیات کے تذکرے پر مشتمل ہے، ان شخصیات میں کارکن اور رہنما دونوں شامل ہیں۔ جو خاکے لکھے گئے ہیں، ان میں سے کچھ مختصر اور کچھ نسبتاً طویل ہیں۔ اعز عزیزی صاحب کی کوشش یہ نظر آتی ہے کہ وہ جن لوگوں کے تذکرے کو ضروری سمجھتے ہیں ان میں سے کوئی نظر انداز نہ ہو خواہ ان میں سے کچھ کے بارے میں مختصر ہی لکھ پائیں۔

اعز عزیزی صاحب خود بھی بائیں بازو کی جدوجہد میں شامل رہے ہیں اور انہوں نے بساط بھر اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ ان کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے بھی تھا جو محنت کشوں کی تحریکوں میں سرگرم حصہ لیتا رہا۔ اعز عزیزی صاحب کی نظریاتی وابستگی جس نے ان کو ہمیشہ عملاً متحرک رکھا، اس کتاب کی تحریر کا بھی موجب بنی۔ پاکستان میں بائیں بازو پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مشاہدات و تاثرات کی شکل میں ایسے مواد کے طور پر بہم ہوگی جس کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگا۔

اب جبکہ پاکستان کی سیاسی تاریخ تقریباً سات عشروں کی مدت پر پھیل چکی ہے اور ہمارا سیاسی عمل اتار چڑھاؤ کے بہت سے مرحلوں سے گزر چکا ہے، یہ ضروری ہو چکا ہے کہ ملک کی سیاسی تاریخ کو معروضی انداز سے دیکھا جائے اور ریاست اور معاشرے میں کارفرما مختلف قوتوں کے کردار کا تقابلی جائزہ لیا جائے۔ اب تک بائیں بازو کے کردار پر جو بحث و مباحثہ اور محاکمہ ہوتا رہا ہے وہ بائیں بازو کی جماعتوں اور شخصیات کو ملک کے ریاستی دروبست اور معاشرے کی دیگر قوتوں سے جن میں مقتدر طبقات اور اشرافیہ کا کردار شامل ہے، الگ رکھ کر یا Isolation میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ بائیں بازو کے لوگ اور تنظیمیں کسی خلا میں تو کام نہیں

کررہی تھیں۔ وہ معاشرے میں موجود عوام دشمن قوتوں سے نبرد آزما تھیں اور ریاست کی جابرانہ پالیسیوں کا ہدف بھی بن رہی تھیں، بدقسمتی سے برسہا برس سے بائیں بازو کے حوالے سے ایک ایسے بیانیے کو فروغ دیا جارہا ہے جس میں نہ تو معاشرے کی عوام دشمن قوتوں، جاگیرداروں، قبائلی سرداروں، سرمایہ داروں اور نودولتیوں کا کوئی حوالہ آتا ہے، اور نہ ہی ریاست کی سطح پر جس نوع کے اقدامات بائیں بازو کی تنظیموں اور شخصیات کے خلاف کیے جاتے رہے، ان کو نظر میں رکھا جاتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جب بائیں بازو کی سیاست کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس میں لامحالہ تنقید اور بے جا تنقید زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ مخالفین کے لیے تو یہ طرزِ عمل بڑا سودمند ہوسکتا ہے لیکن اکثر و بیشتر ہمارے بائیں بازو کے حلقے اور احباب بھی اسی یک طرفہ رو میں بہہ جاتے ہیں چنانچہ وہ اپنے ماضی کو کسی معروضی پیرائے میں بیان کرنے کے بجائے اپنی مبینہ ناکامیوں اور فروگذاشتوں پر ماتم کرنے لگتے ہیں۔ خود تنقیدی اور خود احتسابی کو ہمیشہ اچھے رویوں کے طور پر دیکھا جاتا ہے بلکہ یہ رویے آگے بڑھنے اور ماضی کی غلطیوں کو دہرانے سے محفوظ رہنے کے نقطۂ نظر سے کارآمد ہوتے ہیں لیکن خود احتسابی اور خود تنقیدی اگر خود ملامتی میں تبدیل ہو جائے تو انسان کے پاس ماتمِ یک شہرِ آرزو کے علاوہ کچھ باقی نہیں بچتا۔ ہمارے بہت سے انقلابی دوست اور ماضی میں بہت انہماک سے سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے والے سیاسی کارکن اور رہنما ان دنوں خود ملامتی کی اس بیماری کا شکار نظر آتے ہیں۔

اگر بائیں بازو کی ماضی کی سیاست کو معروضی انداز میں دیکھنا مقصود ہو تو ضروری ہے کہ فیصلوں میں درآنے والے تجزیوں کی کمی، ارادے اور استقلال کی مطلوب سطح کا موجود نہ ہونا، یہ اور ایسے ہی مسائل ضرور پیش نظر رکھے جائیں، لیکن یہ بھی نظرانداز نہ کیا جائے کہ ہماری بائیں بازو کی سیاسی تنظیمیں اور رہنما کن نامساعد حالات میں کام کررہے تھے۔ ریاستی اداروں نے شہری آزادیوں پر کس طرح کی قدغنیں لگا رکھی تھیں۔ کالے قوانین نے اظہارِ رائے، حریّت فکر اور اجتماعی عمل پر کس طرح کی بندشیں لگا رکھی تھیں، ملک بھر میں کس طرح عقوبت خانے بنائے گئے تھے، عدالتیں بے فیض تھیں، اور انصاف کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا، ایسے میں بائیں بازو کی کون سی تنظیم تھی جس پر ریاستی بجلی نہیں گری، ۱۹۴۸ء میں خان عبدالغفار اور جی ایم سید کی بنائی ہوئی پیپلز پارٹی چند ہی دنوں میں غیر قانونی قرار دے دی گئی، جو سیاسی و انقلابی کارکن اور تنظیمیں قیام

پاکستان سے پہلے سے موجود تھیں، ان کے حوالے سے برطانوی استعماری حکومت نے جاتے جاتے ساری خفیہ رپورٹیں ہماری نوآزاد مملکت کے خفیہ اداروں کے سپرد کردی تھیں، سو بائیں بازو والوں کے نقطۂ نظر سے برطانوی راج اور نوآزاد مملکت کی پالیسی میں کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔ یہ صورتِ حال صرف بائیں بازو کی تنظیموں تک محدود نہیں تھی بلکہ استعماری مملکت سے مابعد استعماری نظام کا سفر پالیسیوں کے تسلسل اور حاکمیت کے نظام کی برقراری کا علمبردار ثابت ہوا۔ لہٰذا شہریوں کے نقطۂ نظر سے بھی ملک کی آزادی حقیقی آزادی ثابت نہیں ہوئی۔ فیض احمد فیض جب یہ کہہ رہے تھے، داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر، تو وہ نئی مملکت پر نہ تو طنز کررہے تھے نہ کوئی ملک دشمنی کا اظہار ان کے پیش نظر تھا بلکہ وہ صرف اس غم کا اظہار کررہے تھے، کہ جن آدرشوں کے لیے یہ مملکت قائم کی گئی تھی وہ کس طرح پادرِ ہوا ثابت ہوئے، ذرا غور سے دیکھیں تو اس مصرعے میں حُبِ وطن کی خوشبو کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ابتدائی برسوں میں جس جابرانہ نظام میں ہمارے سیاسی سفر کا آغاز ہوا۔ وہی بعد کے برسوں میں پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ نتیجتاً جمہوریت اور سماجی انصاف کے لیے آواز اٹھانے والوں کی آزمائش بھی بڑھتی چلی گئی۔ مزدور تنظیمیں، طلبہ کی یونینیں، سیاسی جماعتیں وقتاً فوقتاً پابندیوں کا شکار ہوئیں۔ کارکنوں اور رہنماؤں کو قید و بند کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سوں کو ملک بدر کیا گیا، جیلوں میں کارکنوں کو کوڑے لگائے گئے۔ یہ اور ایسے ہی مظالم ہیں جن سے ہماری سیاسی تاریخ بھری پڑی ہے۔ یہی حالات ہیں جن کا مطالعہ گہرائی میں جاکر کیا جانا چاہیے۔ پاکستان میں ریاست کی نوعیت، اس کے کردار اور پالیسیوں کے جائزے کے بغیر کوئی سیاسی مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ملک کے مقتدر اور ملکیت یافتہ طبقات کا کردار بھی پیش نظر رکھے بغیر بائیں بازو کی سیاست مناسب طور پر زیرِ بحث نہیں لائی جاسکتی۔

اس وسیع تر تناظر میں دیکھیں تو بائیں بازو کے کردار کو مثبت انداز میں دیکھنے سے کسی طور مفر نہیں ہوگا۔ ہمارے کارکنوں کی اکثریت نے مصلحتوں سے آزاد رہ کر تمام تر اخلاص کے ساتھ کام کیا۔ انھوں نے اپنی ذاتی اور اپنے خاندانوں کی خوشی و خوشحالی پر اپنی جدوجہد کو فائق تصور کیا، اور پھر ان کی یہ ساری جدوجہد مکمل طور پر رائیگاں بھی نہیں گئی۔ کیونکہ آج ملک میں آزادیٔ رائے، آزادیٔ افکار، خواتین کے حقوق، مملکت کے غیر مسلم شہریوں کی دیگر شہریوں کے ساتھ برابری......

یہ اور ایسے ہی تصورات اگر ماضی کے مقابلے میں آج زیادہ قبولیت کے حامل نظر آتے ہیں، اور خود بہت سی ایسی جماعتیں بھی، جو ماضی میں ان تصورات کی کھل کر مخالفت کرتی تھیں، اب اپنے رویوں میں کسی قدر تبدیلی پر مجبور ہوئی ہیں، تو اس سب کا بنیادی سبب ماضی میں جمہوریت اور سماجی انصاف کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کا کردار رہا ہے۔

زیر نظر کتاب اسی تاریخ ساز جدو جہد کے چند پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے، اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، یہ کام چند شخصیات، جن میں کارکن اور رہنما دونوں شامل ہیں، کے بارے میں لکھتے ہوئے اجاگر کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں سب سے طویل مضمون حسن ناصر کے بارے میں ہے۔ اعز عزیزی صاحب نے اس موضوع پر بہت سی معلومات فراہم کی ہیں جن میں سے کئی باتیں پہلی بار منظر عام پر آرہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ اس کتاب کو پاکستان کے ترقی پسند سیاسی ادب میں ایک اچھے اضافے کی حیثیت بھی حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر سید جعفر احمد

گذارشِ احوال

پاپا کے لکھے ہوئے خاکوں پر مشتمل کتاب بالآخر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اصولاً اس کتاب کو بہت پہلے یعنی پاپا کی زندگی میں ہی شائع ہو جانا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہمارے پاپا کی خواہش اور اُن کے دوستوں کا اصرار تھا۔

اس کتاب کی اشاعت کو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری چونکہ ہماری تھی لہٰذا کچھ تو غمِ روزگار کے مسائل اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر کتاب کی اشاعت کا منصوبہ کھٹائی میں پڑتا رہا۔ (اسی دوران پاپا کا انتقال بھی ہو گیا۔) اُن کی وفات کے بعد کوئی روز نہ گزرتا تھا کہ جب ہمیں اُن کے دوستوں، احباب اور خاندان کے افراد کی جانب سے اس سوال کا سامنا نہ کرنا پڑتا ہو کہ ''میاں کتاب کب آ رہی ہے؟'' اب یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں جہاں مذکورہ بالا دو جوابات کے علاوہ اب ایک اور فکر بھی دامن گیر ہو گئی تھی کہ کیا ہم اس کتاب کی اشاعت اس طرح کر بھی پائیں گے کہ جس کی متقاضی یہ کتاب اپنی ہیّت اور پاپا کی سوچ کے مطابق ہو۔ کیونکہ جب ہم نے پاپا کی تحریروں کو بغرض اشاعت دیکھنا شروع کیا تو وہ اتنی متنوع اور مختلف موضوعات پہ پھیلی ہوئی ہیں کہ بارہا یہ سوال ذہن میں آیا کہ "پتھر بہت بھاری ہے اور یہ کہ اسے چوم کر چھوڑ دیا جائے" لیکن کیا کرتے کہ ان تمام بزرگوں، دوستوں، احباب اور رشتہ داروں کا جو مستقل بنیادوں پہ کتاب کی اشاعت کے بارے میں ہماری کارگردگی کی رپورٹ مانگنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس صورتحال میں ہمارے لیے زیادہ عرصہ خود کو "انڈر گراؤنڈ" رکھنا مشکل ہو گیا تو یہ طے پایا کہ پاپا کی تمام تحریروں میں سے اول ان مضامین کو شائع کیا جائے جو انھوں نے اپنے انقلابی رہنماؤں اور رفیقوں کے بارے میں تحریر کیے تھے۔ ان مضامین میں جہاں اک طرف پاپا کے اپنے رفقا،

ساتھیوں اور رہنماؤں سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ انھیں ضبط تحریر میں لانے کا مقصد پاپا کا اس تحریک کے ساتھ عشق اور جذباتی لگاؤ بھی نظر آتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ان خاکوں کو تحریر کرتے ہوئے جو بات خاص طور پر ان کے ذہن میں رہی ہوگی اس کا مقصد یہ بھی ہوگا کہ اس انقلابی تحریک کے تاریخی تسلسل میں اس "مرحلے" کو تحریر کیا جائے اور اس زمانے کے سوالات چاہے وہ سیاسی ہوں، تنظیمی یا پھر نظریاتی کو آج کے قاری کے سامنے لایا جاسکے۔ اور ساتھ ہی اس زمانے کے نامساعد حالات کے باوجود ساتھیوں کی اپنی تحریک و تنظیم کے ساتھ وابستگی اس کی کامیابی کا یقین اس کی سچائی اور اپنے آدرشوں پہ ایمان کے ساتھ ساتھ ان رفیقوں اور رہنماؤں کی بے لوث جدوجہد اور کردار کی عکاسی بھی شامل ہے جس کا اہم عنصر اپنی دھرتی اور اس پر بسنے والے مفلوک الحال بے بس عوام کے ساتھ عشق کی معراج ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے فیصلے تک پہنچنے میں مجھے اپنے دوست امجد سلیم منہاس کا بھرپور تعاون حاصل رہا جو کہ نہ صرف کتاب کی اشاعت کے تمام مراحل میں شامل رہے وہ اس کتاب کے ناشر بھی ہیں میں امجد سلیم کا بہت مشکور ہوں کہ اگر کتاب کی اشاعت میں ان کی ذاتی دلچسپی اور پاپا کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم کی پاسداری نہ ہوتی تو میرے لیئے تنہا یہ کام سرانجام دینا خاصہ مشکل ہوجاتا۔ یہاں میں اپنے گڈو بھائی جان (ڈاکٹر حسن ناصر) کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کے ساتھ مل کر ہم نے پاپا کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنی یادداشتوں کو ضبط تحریر میں لائیں اور اس بات کی تحریک دی تھی کہ ان یادداشتوں کو کتابی شکل دینی چاہیے۔ حسب عادت وہ مجھے "پارٹی لائین" دے کے خود روزمرہ کہ سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔ لیکن جب بھی ملاقات ہوتی کتاب کے بارے میں اپنی رائے دیتے رہے اور اس بات کا بھی اعلان کرتے رہے کہ اس سلسلے میں ان کی خدمات کسی وقت بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں ان کی جانب سے ملنے والے تمام مشوروں کا بھی تہہ دل سے مشکور ہوں۔ میں اپنے ماموں اور معروف نقاد، ادیب اور شاعر جناب مظہر جمیل صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جن کی شفقت، سرپرستی اور رہنمائی نے میرے لئے بہت سی آسانیاں پیدا کیں اور اس کتاب کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ جناب ڈاکٹر جعفر احمد صاحب اور محترم پروفیسر سحر انصاری صاحب کا بھی بہت شکرگزار ہوں جنھوں نے کتاب کے بارے میں اپنے تاثرات پر مبنی مضامین مرحمت فرمائے جو کہ اس کتاب کا حصہ ہیں۔ میں عبید

بھائی (عبید اللہ عثمانی) کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے چند اہم تصاویر اس کتاب میں شامل کروائیں۔

آخر میں اپنے تمام اہلِ خانہ سید آذر عزیزی، لبنیٰ آذر، عظمیٰ اشفاق، مونا عزیزی، امر عزیزی، موہنی امر، بینا عمیر، عمیر راشد اور خاص طور پر غزل احمر کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ جو نہ صرف یہ کہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے بلکہ میری تقویت کا بھی باعث بنے۔

مجھے امید ہے کہ پاپا کی یہ کاوش اس سماج کے اندھیروں کو دور کرنے کی روشنی میں اپنا حصہ ادا کرے گی جس سے نہ صرف پورا معاشرہ منور ہوگا بلکہ جس کے ساتھ ساتھ عینہ، اشعر، فبہا، ملیحہ، نہا، اثمر، اثر، عائشہ، اجر، روشانے اور زوریز بھی سرفراز ہوسکیں گے۔

سید احمر عزیزی

حصہ اوّل

حسن ناصر: قصہ ایک باغی شہزادے کا

1954ء کی بات ہے، راولپنڈی سازش کیس کو عدالت نے عدم ثبوت کی بنا پر کالعدم قرار دے کر تمام گرفتار شدگان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ سجاد ظہیر، سبط حسن، فیض احمد فیض، میجر اسحاق، حسن ناصر اور دیگر تمام کمیونسٹ رہنما رہا ہو گئے لیکن حسن ناصر کو رہائی کے فوری بعد ملک بدری کا حکم ملا۔ انھیں ۷۲ گھنٹوں میں پاکستان چھوڑ دینا تھا، ساتھ ہی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی بھی عائد کر دی گئی۔ ناصر کراچی کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری تھے۔ انھیں یہ عہدہ معروف اداکار اور ڈائریکٹر اے۔ کے۔ ہنگل کی جگہ، جو ہندوستان روانہ ہو گئے تھے ملا تھا۔ ناصر کی خواہش تھی کہ وہ آخری بار تمام کارکنوں سے ملاقات کر لیں۔ بندر روڈ کراچی کے مرکزی دفتر واقع لائٹ ہاؤس کی ایک شام بڑی پُر رونق تھی، ایک میلہ لگا ہوا تھا، دور دور سے کارکن پہنچے ہوئے تھے۔ ٹیکسٹائل کے مزدور، شو ورکر، بیڑی ورکر، خاکروب کارکن، ریلوے ورکرز، منگھو پیر، شیر شاہ، کیماڑی، لانڈھی سے تمام لوگ پہنچے ہوئے تھے۔ جو گروپ لانڈھی، مرغی خانہ، قائد آباد اور معین آباد سے آیا ہوا تھا اس میں ہم لوگ کامریڈز بیر اور اعزاز نذیر کی ہمراہی میں آئے ہوئے تھے، جن میں عبدالسلام، حبیب بغدادی، محمد کاظم، غوث علی، رزاق میکش، ابراہیم شارق، قمرالدین، شرف الدین، نجیب الدین، وقار فاروق، حاجی عدیل اور سدّی محمود شامل تھے۔ لانڈھی سے آنے والے تمام کارکنوں کا تعلق حیدر آباد دکن سے تھا جو ماچس فیکٹری کی یونین میں کام کرتے تھے۔ ہم سب لوکل ٹرین میں بیٹھ کر آئے تھے۔ تمام راستہ ٹرین کے ڈبے میں مخدوم کی نظمیں اور ترانے گاتے اور خوب شور شرابہ کرتے ہوئے پارٹی آفس پہنچے تو ہمارا جوش و خروش اور دوبالا ہو گیا۔ یہ تین منزلہ

عمارت تھی، نیچے دکانیں تھیں اُس سے اوپر والی منزل پر ٹریڈ یونین کا دفتر تھا اور آخری منزل پر پارٹی آفس تھا جس کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی دفتر تھا۔ پابندی لگنے کے بعد یہ پوری منزل مقفل کر دی گئی تھی۔

حسن ناصر ٹریڈ یونین آفس میں پہلے سے موجود تھے۔ ہم پہلی دفعہ انھیں دیکھ رہے تھے۔ دراز قد، چوڑے شانے، سرخ و سفید رنگت، ستواں ناک، گہری سیاہ آنکھیں، بارعب مونچھیں، چہرے پر مستقل مسکراہٹ، سفید اور چمکدار دانت جو تسبیح کی طرح ایک قطار میں پروے ہوئے تھے۔ چوڑی پیشانی، سیاہ گھونگریالے بال، سفید آستینوں والی بشرٹ جس کے سامنے دو بڑی بڑی جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ خاکی کاڈرائے کی پتلون، کشمشی رنگ کے سویٹ کے جوتے۔ یااللہ! یہ کس سرزمین کا شہزادہ ہے، جب ہاتھ ملایا تو میری حیرت مزید بڑھی، یوں لگا جیسے میدے کا پیڑا ہاتھ میں آ گیا ہے۔ میں کمیونسٹوں سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ تلنگانے کی سرحد پر واقع حیدرآباد دکن کی ایک بستی سرُونگر سے پاکستان وارد ہوا تھا جہاں کے کمیونسٹ کالے بھجنگ، موٹی موٹی ناک، موٹے ہونٹ، پستہ قد، گٹھیلے بدن، سخت کُھردرے ہاتھ، ہنستے کم ہی تھے۔ چہرے پر ہمہ وقت غصہ چھایا ہوا ہوتا، خود میرے بڑے بھائی اعزاز نذیر اسی حُلیے کے حامل تھے۔ (یہ میری نوعمری کے تاثرات ہیں۔) لیکن یہ حسن ناصر میرے تصور سے یکسر مختلف تھے، جو حلیہ میں نے اپنے ذہن میں بنایا تھا اس کے برعکس ایک وجیہہ و شکیل نوجوان میرے سامنے تھا جو ہنس ہنس کر لوگوں سے ملتا، چھوٹوں کے ساتھ شفقت، بزرگوں کے ساتھ مؤدب، دھیمے انداز میں بولتا اور سارا وقت مسکراتا رہا۔

پاکستان بھر سے صرف حسن ناصر کو رہا کرنے کے بعد جلاوطن کر دینا بڑی غور طلب بات تھی۔ اس نوجوان کو حکومتِ وقت اس قدر خطرناک سمجھتی تھی، اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ سجاد ظہیر ہندوستان واپس چلے گئے تھے اور اب حسن ناصر ملک بدر ہو رہے تھے۔ عوام دشمن طاقتیں سُکھ کا سانس لے رہی تھیں۔ اُنھوں نے وقت کا پہیہ روک لیا تھا۔ تاریخ کا دھارا رُک چکا تھا، ٹھہر چکا تھا؟ یہ اُن کی بھول تھی۔

ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران حسن ناصر نے بہت کام کیا۔ حیدرآباد میں اپنے پرانے ساتھیوں اور رہبروں سے ملاقاتیں کیں۔ مخدوم محی الدین، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ھ، ڈاکٹر علی جواد رضوی، مُغنی تبسم، روی ناریُن ریڈی اور بہت سے دوستوں سے ملے، اُنھیں پاکستان میں

کمیونسٹ تحریک کے بارے میں آگاہی دی۔ دہلی جاکر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکریٹری اجے گھوش سے ملے۔ مدراس جاکر کیرالہ صوبے کے وزیرِ اعلیٰ ای۔ ایم۔ ایس نمبو دری پد سے ملے۔ جنہوں نے کیرالہ میں اپنی کمیونسٹ گورنمنٹ قائم کرلی تھی۔ کلکتہ گئے اور بنگال کے وزیرِ اعلیٰ جیوتی باسو سے ملاقات کی اور پھر وہاں سے خفیہ طریقے سے مشرقی پاکستان پہنچے۔ کامریڈ مونی سنگھ، کامریڈ طوحٰہ اور پروفیسر مظفر احمد جو اُن دنوں روپوش تھے، سے مل کر مغربی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا الحاق قائم کیا۔ سائیں عزیز اللہ کا تعارف کروایا جو مستقبل میں دونوں طرف کی پارٹیوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بننے والے تھے۔ یہ ایک تاریخی کارنامہ تھا جو حسن ناصر کی دلیری، بہادری اور مستقبل بینی کا آئینہ دار تھا، جلاوطنی نے تو تاریخ کا راستہ متعین کردیا تھا۔

ناصر نے جب تمام کام انجام دے دیا تو والدین کے اصرار پر سوئٹزرلینڈ تفریح کی غرض سے چلے گئے۔

اِدھر پاکستان میں پارٹی کا دفتر مکمل بند ہو چکا تھا۔ کارکنوں کے آپس میں ملنے اور جمع ہونے کے لیے کوئی جگہ میسر نہیں تھی تو پھر چائے خانے آباد ہوئے۔ منگھو پیر روڈ پر بسم اللہ ہوٹل، لانڈھی میں کاکو کا ہوٹل، قائد آباد میں جانی بھائی کا ہوٹل، برنس روڈ پر پیف ریسٹورنٹ، صدر میں کیفے جارج، انڈیا کافی ہاؤس، پیر کالونی میں خیر آباد ریسٹورنٹ، حیدر آباد کالونی میں مسرت گاہ۔ چار پیسے کی ایک پیالی ملتی تھی۔ سب ''امریکی سسٹم'' (یہ اُسی زمانے کی ایجاد تھی) اپنی اپنی چائے کے پیسے نکال کر ٹیبل پر رکھ دیا کرتے تھے، اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کسی کے پاس پیسے نہیں ہوتے تو یوں ہی ہوٹلوں میں بیٹھ کر گپ شپ کر کے اُٹھ جایا کرتے تھے تو پیچھے سے بیرا پکارتا تھا، کھایا پیا کچھ نہیں کرسی توڑا، اس پر کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا مالک اور ہم مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے۔

یہ زمانہ ہماری بے روزگاری کا تھا، ہم بڑے نامی گرامی بے روزگار ہوا کرتے تھے۔ نوکری ہمیں ملتی نہیں تھی اور جو مل جاتی ہم معمولی سی بات پر استحصال استحصال کا نعرہ لگا کر باہر آجاتے۔ ویسے بھی اُن دنوں بے روزگاری میں بڑی رومانویت تھی۔ میلوں پیدل چلتے، فاقے کرتے جب زیادہ بھوک ستاتی تو چنے کھالیا کرتے، مانگ کر سگریٹ پیا کرتے، عجیب دن تھے۔ انقلاب سامنے نظر آتا تھا۔

ملک کی تمام ذیلی سیاسی تنظیمیں ایک دوسرے میں ضم ہو رہی تھیں، سب کو احساس ہو چکا

تھا کہ موجودہ رجعت پسندوں اور عوام دشمن طاقتوں کا تن تنہا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مضبوط اور متحد سیاسی قوت بننا ضروری ہے۔ خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمتگار تحریک اور ورور پختون ایک ہو چکے تھے۔ عبدالصمد خان اچکزئی، غوث بخش بزنجو، سندھ کے جی۔ ایم۔ سید، حیدر بخش جتوئی، شیخ عبدالمجید سندھی، محمود الحق عثمانی سب ایک نئی تنظیم نیشنل پارٹی میں جمع ہو رہے تھے۔ میاں افتخار الدین نے بھی آزاد پاکستان پارٹی ختم کر دی تھی۔ شہر میں بڑی گہما گہمی رہتی، کوئی رہنما آ رہا ہے تو کوئی واپس ہو رہا ہوتا۔ کارکن اُن کا استقبال کرتے، جانے والوں کو الوداع کہتے۔ کبھی ایک میٹنگ عثمانی صاحب کے گھر پر ہو رہی ہے تو دوسری جی۔ ایم۔ سید کے گھر حیدر منزل پر۔ ایسا ہی ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا۔ حیدر منزل پر ظہرانہ دیا جا رہا تھا۔ اندرونِ سندھ سے تمام سیاسی کارکن شریک تھے۔ ایک بڑے سے ہال میں بڑا سا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ تمام مدعوئین آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہم چاولوں کی پلیٹیں بھر بھر کر پہنچا رہے تھے، جب تمام پلیٹیں پہنچ گئیں تو شیخ عبدالمجید سندھی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا بس اب آپ بھی بیٹھ جائیں، میں جگہ کی تلاش میں تھا تو خود اپنے دونوں گھٹنوں کو موڑ کر بیٹھ گئے اور کہا آپ میرے پاس آ جائیں۔ دبلے پتلے آدمی ہو، آسانی سے بیٹھ سکو گے۔ میں بیٹھ گیا تو شیخ صاحب نے زور سے بسم اللہ کہا اور چاولوں سے بھرا ہوا چمچہ پہلے میری پلیٹ میں جو دائیں جانب تھی ڈالا اور پھر دوسرا چمچہ اپنے بائیں بازو کی پلیٹ میں ڈالا اور تب جا کر خود لے کر کھانا شروع کیا۔ مجھے ان کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ پُرانے وقتوں کے لوگ کس قدر وضع دار ہوا کرتے تھے۔ ویسے شیخ عبدالمجید سندھی ہم سرخوں سے بہت چڑتے تھے، ہماری تحریکوں میں زیادہ تر انہی کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوتی۔ شیخ عبدالمجید سندھی اصلاً ہندو تھے اور عبید اللہ سندھی کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے جو خود بھی ہندو تھے۔

یہاں ایک اہم واقعے کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔ شہر میں جلسے اور جلوس تو نکلتے ہی رہتے تھے۔ سائیں جی۔ ایم۔ سید اور حیدر بخش جتوئی نے پورے سندھ سے کسانوں کو جمع کر کے کراچی میں مظاہرہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ ایک دن صبح کی ٹرین سے یہ کسان سرخ پگڑیاں سر پر باندھے سرخ کرتوں میں ملبوس، ہاتھوں میں کلہاڑیاں پکڑے سینکڑوں کی تعداد میں کینٹ اسٹیشن پہنچے۔ یہ لوگ جئے سندھ اور جئے پاکستان کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ عوامی طاقت اور جلال و جبروت کا ایک عظیم مظاہرہ تھا۔ باہر ان کے استقبال کے لیے ہم سب ایک بڑی تعداد میں

موجود تھے۔جلوس کی قیادت کامریڈ سوبھوگیان چندانی کررہے تھے، اس میں سائیں عزیز اللہ، مولوی نذیر، کامریڈ عبدالقادر، کامریڈ عبدالخالق آزاد وغیرہ بھی تھے۔ جوشیلے کسانوں کا کلہاڑیوں کو اوپر اُٹھا اُٹھا کر چلنا ایک عجیب سی ہیبت طاری کررہا تھا۔ان کی گرمجوشی خون کو کھولا رہی تھی۔ہم لوگوں کے سینے اُبھرے ہوئے اور گردنیں تنی ہوئیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر نعروں کا جواب دے رہے تھے۔آگے آگے ایک چھوٹا سا شخص ہڈیوں کا ڈھانچہ اُچھل اُچھل کر نعرے لگا رہا تھا۔ یہ الطاف آزاد تھے۔ میں نے اُن کو اپنے کاندھوں پر بٹھالیا، اب اُن کی آواز زیادہ نمایاں ہوگئی تھی۔ یہ جلوس پیدل چلتا ہوا پٹیل پارک پہنچا جواب نشتر پارک ہے۔دوسرے دن رجعت پسند اور مسلم لیگی اخباروں نے شہ سرخیاں لگائیں کہ سندھ سے تمام ڈاکو خونی اور قاتل ہتھیاروں کی نمائش کرتے ہوئے شہر کی سڑکوں پر دندناتے رہے۔اس خوفناک مظاہرے کی قیادت مشہور ہندو کمیونسٹ کررہا تھا۔ یہ لوگ پاکستان مخالف نعرے لگا رہے تھے۔حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ زمین کو کسانوں میں تقسیم کردو، ہاری حقدار، ون یونٹ توڑ دو کے نعرے لگا رہے تھے۔ بہت پُرامن اور منظّم تھے۔جس سے ان کی سیاسی تربیت کا اندازہ ہورہا تھا۔

حسن ناصر کی واپسی کی چہ مگوئیاں سُنی جارہی تھیں۔لیکن کسی کو پوری طرح علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور کہاں دیکھے گئے۔

قاضی فیض محمد نے اعلان کیا کہ وہ بہت جلد اپنے گاؤں سرہاری میں ایک کل پاکستان کانفرنس کرنے والے ہیں۔کارکنوں کا جوش وخروش اس اعلان پر دیدنی تھا۔ہم لوگ اس کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے۔مختلف یونینوں اور انجمنوں سے رابطے شروع ہوئے، ٹیکسٹائل کے مزدور، شُو ورکرز، بیڑی ورکرز، طلباء تنظیم، صحافی، ڈاکٹرز، شاعر وادیب غرض کہ ہر شعبہ ہائے زندگی کے لوگوں کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے پورے شہر میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی۔ پسنجر ٹرین ''لُنڈ ڈ'' سے روانگی طے پائی۔ سب کینٹ اسٹیشن پر جمع ہوئے، جگہ جگہ ٹرین رکتی اور کارکن سوار ہوتے گئے۔ میں ہر اسٹیشن پر اُتر جاتا، میری نگاہیں کسی کو تلاش کررہی تھیں۔دفعتاً ٹرین کے ایک ڈبے میں کارکنوں سے الگ تھلگ حسن ناصر سفید بشرٹ اور خاکی پتلون میں ملبوس (یہ اُن کا پسندیدہ لباس تھا) نظر آہی گئے۔ میں احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے انجان بنا رہا اور سرہاری ہی میں جاکر ناصر سے ملاقات کی۔ سرہاری اسٹیشن پر چند اور ٹرینیں بھی اندرون سندھ سے کارکنوں کو لے

کر پہنچی تھیں۔ اعزاز نظیر، فتح اللہ عثمانی، رکن الدین قاسمی، ابنِ ایوب، حسن حمیدی، علی مطاہر جعفری، باقر شاہ، رشید احمد ایڈووکیٹ، برکت علی آزاد، کامریڈ عبدالقادر، عبدالخالق آزاد، غلام محمد لغاری سب سے ملاقات ہوگئی۔ سرہاری اسٹیشن پر ہم سب کا استقبال کرنے کے لیے کامریڈ عزیز سلام بخاری کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ پہنچے تھے۔ سرخ جھنڈوں اور سرخ بینروں سے پورا جلوس مزین تھا۔ کانفرنس میں پورے پاکستان کے سیاسی کارکن اور رہنما شریک تھے۔ کانفرنس دو دن جاری رہی اور فیصلہ ہوا کہ ایک نئی ترقی پسند سامراج دشمن، کسانوں اور مزدوروں کی نمائندہ سیاسی پارٹی جو آزاد خارجہ پالیسی اور وڈیروں اور جاگیرداروں کی مخالف ہوگی جس کا پروگرام پاکستان میں فلاحی مملکت کا قیام ہوگا۔ پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے نام سے وجود میں آگئی۔ مشرقی پاکستان میں بھی ایسی ہی ایک کانفرنس نے وہاں کی تمام چھوٹی چھوٹی سیاسی تنظیموں کے اشتراک سے وجود میں آنے والی عوامی لیگ بھاشانی گروپ کو نیشنل پارٹی میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اب کُل پاکستان نیشنل عوامی پارٹی دونوں بازوؤں میں منظم ہوگئی۔ یہ تاریخ کا ایک بہت بڑا سیاسی واقعہ تھا۔ جس کی تشکیل اور قیام میں ایک ہی طاقت تھی جو پاکستان کے ترقی پسند اور کمیونسٹ تھے ان ہی کی قوتِ محرکہ ملک کی تقدیر کو اپنی فکر کی سچائی سے آراستہ کرکے عوام کو خوشحالی کے راستے پر گامزن کررہی تھی۔ کانفرنس کی قراردادوں کی ڈرافٹنگ کمیٹی میں حسن ناصر، میجر محمد اسحاق اور اجمل خٹک پیش پیش تھے۔

ناصر اس کامیابی پر بے انتہا خوش تھے، ان کی مسکراہٹ پورے چہرے پر ایک روشنی کی طرح پھیل گئی تھی۔ کارکنوں کو یہ پیغام دے رہی تھی کہ بالآخر ہم سُرخرو ہوئے۔

یہ غالباً 1956ء تھا جب کراچی میں نیشنل عوامی پارٹی کا مرکزی دفتر قائم ہوگیا۔ ریڈیو پاکستان کے عقب میں رام چندر ٹیمپل روڈ پر ایک پرانی رہائش کا حصہ جو ایک وارانڈہ اور ایک چھوٹا سا کمرہ اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا، ہم لوگوں کی خوشی کو دوبالا کرتا تھا۔ یہ جگہ بہت نمایاں اور شہر کے وسط میں واقع تھی۔ سب کے مل بیٹھنے کا ذریعہ اور باہم گفت وشنید کی سہولت بہم ہوتی، یہاں بیٹھ کر شہر کی مختلف بستیوں میں مظاہرے اور کارنر میٹنگوں کا پروگرام ترتیب دیا جاتا۔

میں تقریباً ہر روز دفتر پہنچ جایا کرتا، پُرانے دوستوں کے ساتھ نئے نئے لوگوں سے بھی ملاقات ہوتی۔ ابتدائی کچھ عرصہ دفتر پر مخالف سوچ کے لوگوں کا قبضہ تھا۔ ان میں بعض C.I.D کے

تنخواہ دار بھی تھے۔ کارکنوں کو محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی۔ آہستہ آہستہ ان افراد کی بے عملی اور مہم پسندی کھل کر سامنے آنے لگی جو تحریک کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی۔ ان ہی دنوں میں ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ NAP کراچی کے جنرل سیکرٹری جو CID کے تنخواہ دار تھے نے ایک کارکن جس کا نام محمد صادق کو اپنے گھر بلایا اور اُس کو پارٹی کا ایک خفیہ ڈاکومنٹ بانٹنے کے لیے دے دیا۔ گھر کے نیچے پہلے سے پولیس اور C.I.D کے افراد موجود تھے۔ صادق جوں ہی سیڑھیوں سے اُتر کر سڑک پر پہنچا تو باہر کھڑے ہوئے سپاہیوں نے اُسے گرفتار کرلیا۔ یہ منصوبہ کیا تھا اور اس کے پیچھے کیا محرکات تھے، کچھ سامنے نہیں آیا لیکن اتنا ہوا کہ پارٹی کا ایک کارکن رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ صادق کو کئی دن تک شدید اذیتیں دی گئیں اور اُس کو جاں بہ لب کر کے رہا کیا گیا۔ صادق اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اُس نے اپنی ساری زندگی گوشہ نشینی میں گزار دی۔ میں اُس سے ایک واقف کار کے ذریعہ اُس کے گھر جا کر ملا، تقریباً ۸ سال کا عرصہ ہوا ہوگا۔ وہ اب سب کچھ بھول چکا ہے، بہت بوڑھا ہو گیا تھا، نارتھ کراچی میں مقیم ہے۔

آخر کار حسن ناصر نے دفتر کا چارج سنبھال لیا۔ وہ مرکزی آفس سیکریٹری کی حیثیت سے دفتر ہی میں مقیم ہو گئے۔ ناصر کے اس مستحسن اقدام سے مخالف گروپ کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔ اب کارکنوں میں ایک نیا جذبہ اور جوش پیدا ہو گیا اور دفتر میں خوب چہل پہل ہونے لگی۔ چند کارکنوں نے مستقل دفتر میں ٹھکانہ بنالیا تھا، جس میں، میں بھی شامل تھا۔

ایک چوکیدار بھی رکھ لیا گیا تھا، جس کا نام میر عالم تھا۔ یہ پختون تھا اور خدائی خدمتگار تحریک کا سرگرم کارکن تھا۔ نظم وضبط اور ڈسپلن کا سخت پابند تھا۔ کوئی بات غلط دیکھتا تو ڈانٹ دیا کرتا تھا، ہم سب کو صبح کی چائے ٹھیک وقت پر دے دیتا، جو دیر سے سو کر اُٹھتا تو اُس کی چائے موقوف ہو جاتی۔ ناصر اس کو بہت پسند کرتے تھے، جو خود بھی وقت اور ڈسپلن کے بہت پابند تھے۔ صبح اُٹھ کر اپنے کپڑے دھوتے، کمرے کی صفائی خود کرتے، ٹیلیفون کے ریسیور کو ڈیٹول سے صاف کرتے، نہادھو کر اخبارات پڑھتے اور پھر صبح کی چائے پیتے۔ ناصر کی سلیقہ مندی دیکھیں اخبارات کی اہم خبروں کو انڈر لائن کرنے کے لیے فٹ پٹی (اسکیل) استعمال کرتے تاکہ لکیر سیدھی رہے۔
پیسے ہوتے تو اچھی سی سگریٹ پی لیتے ورنہ بیڑیاں تو چلتی ہی رہتیں۔ بیڑی پینے سے پہلے اُس کو پلٹ کر پھونک لیا کرتے تھے تاکہ اندر کے تمباکو کی گرد حلق میں نہ جائے۔ کبھی کبھار پھونک مارنے

سے بیڑی کا سارا تمبا کو باہر نکل آ تا تو مسکرا کر کہتے یہ کسی کامریڈ نے بنائی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کوئی زوردار سیاسی بحث چل رہی تھی۔ بیڑی کے ہزاروں کارکن نوے فیصد کٹر قسم کے سوشلسٹ ہوا کرتے تھے اور آپس میں خوب بحث و تکرار کرتے تھے۔ یہ پورے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیاری، چاکیواڑہ، کیماڑی، رنچھوڑ لائن، جونا مارکیٹ، سولجر بازار، لسبیلہ اور صدر ان کے خاص علاقے تھے۔ میں تقریباً سب ہی سے واقف تھا۔ بی ایم کُٹی، محمد علی ملباری، عبداللہ، زین الدین، حسن بھائی اور کمو میرے رابطے میں تھے۔ ان کی اکثریت کیرالہ واپس چلی گئی۔ چند ایک مڈل ایسٹ میں آباد ہو گئے اور کچھ فوت ہو گئے۔

کارکنوں کا ایک دوسرا بڑا گروپ شُو ورکرز کا تھا۔ یہ بھی سینکڑوں کی تعداد میں تھے، ان کی چھوٹی چھوٹی بیٹھکیں پورے لارنس روڈ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ہاتھ سے جوتے بناتے اور اس کو ملکی ضروریات کے علاوہ بیرون ملک بھی ایکسپورٹ کیا کرتے تھے۔ اس کے کاری گر زیادہ تر ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے۔ سمیع داد خان، امیر فیصل درانی اور رحمت علی پارٹی کی طرف سے ان کی تنظیم اور اُن کے مسائل کو حل کرنے پر معمور تھے۔

تیسرا بڑا اور بہت موثر و مضبوط گروپ خاکروبوں کا تھا جو میونسپل کارپوریشن سے منسلک تھے۔ ویسے یہ محلوں میں بھی بکھر کر کام کرتے تھے۔ ان کے سربراہ برصغیر کے مشہور کمیونسٹ رہنما کامریڈ نارائن داس بیچر تھے۔ یہ ان کی یونین کے بانی اور تاحیات صدر تھے۔ بندر روڈ پر ہندوؤں کے مندر میں قیام تھا۔ PWD کی یونین میں کامریڈ محمد زبیر کام کرتے تھے۔ PIA جو پہلے اورینٹ ایئرویز تھی میں طفیل عباس، اقبال علوی اور اظہر عباس کام کرتے تھے۔ ٹیکسٹائل کی صنعتوں میں جو منگھوپیر اور لانڈھی کے علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ماسٹر افضل، علی جان، نعمت اللہ خان، رحمت اللہ اور رمضان چوہان پارٹی کے نمائندے تھے۔ بعد کو کامریڈ زبیر نے عنایت اللہ خان کے ساتھ لانڈھی کے صنعتی ایریا میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اعزاز نذیر نے ماچس فیکٹری کی گمنگ سیکشن کی یونین بنائی اور بہت بڑی لڑائی کا آغاز کیا جس کی بنا پر انھیں لانڈھی بدر کر دیا گیا۔ مزدوروں نے میر لائق علی کی کار پر حملہ کر دیا تھا۔ میر لائق علی حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم اور ٹرسٹ کے چیئرمین بھی تھے۔ سکیورٹی پرنٹنگ پریس میں یامین اور چنگیزی کام کرتے تھے۔ کامریڈ وہاب کانپوری کو ہندوستان میں لال املی ٹیکسٹائل ملز کی یونین میں کامریڈ پی۔ سی۔ جوشی جو کمیونسٹ

پارٹی آف انڈیا کے جنرل سیکریٹری بھی تھے کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل تھا۔ اعظم بستی، پیر کالونی کی جھونپڑیوں میں قیام تھا۔ نوجوان مزدوروں کی سیاسی اور نظریاتی تربیت کا کام انجام دیتے تھے۔ کامریڈ زبیر کوان کا شاگرد کہلانے پر فخر تھا۔

ڈاک یارڈ اور شپ یارڈ میں کامریڈ سوبھو گیان چندانی اور کامریڈ شرف علی کے کام کے اثرات بہت گہرے تھے۔

طلبہ کی تنظیموں میں سب سے اولین تنظیم D.S.F ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھی جس کا ایک تاریخی واقعہ ۸ جنوری 1953ء کی پولیس فائرنگ کا تھا جس میں کئی طلبہ شہید ہوئے تھے۔ اس کے سربراہوں میں ڈاکٹر محمد سرور، ڈاکٹر میر رحمٰن علی ہاشمی اور کامریڈ پوہول، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر غالب اور ڈاکٹر ادیب رضوی شامل تھے۔ D.S.F پر پابندی لگ گئی تو نئی طلبہ تنظیم نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن وجود میں آ گئی، جس کے صدر ڈاکٹر محبوب الدین تھے۔ تقریباً ہر کالج میں اس کا یونٹ قائم ہو چکا تھا۔ ڈاؤ میڈیکل کالج، ڈی جے کالج، ایس ایم کالج اور اسلامیہ کالج میں یہ بڑی مضبوط تنظیمیں تھیں۔ اس کے راہنماؤں میں زین الدین خان لودھی، ڈاکٹر ملک شیر افضل، محمد شفیع، معراج محمد خان، جوہر حسین، واحد بشیر، فتحیاب علی خان، سید سعید حسن اور صبغت اللہ قادری وغیرہ شامل تھے۔

ایک دن ہم معمول کے مطابق دفتر میں بیٹھے تھے، اخبارات پڑھ رہے تھے۔ ناصر اپنے کمرے سے پھرتی کے ساتھ باہر نکل آئے اور کہا آپ لوگوں نے یہ خبر پڑھی۔ کراچی کی بسوں کا کرایہ بڑھا دیا جائے گا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ہم اس کے خلاف بھرپور احتجاج کریں گے۔ ڈرگ روڈ کے محمد فصیح بھی دفتر میں بیٹھنے لگے تھے۔ ہم لوگوں سے کہا کہ فوراً ایک احتجاجی بیان ڈرافٹ کرو۔ ہم ہینڈ بل اور پوسٹر بھی نکالیں گے، یہ کام جلد سے جلد ہونا چاہیے۔

اضافہ صرف ۳ پیسے کا تھا، ۱۲ پیسے کے بجائے ۱۵ پیسے ہونے جا رہے تھے لیکن حسن ناصر یہ اضافہ کسی قیمت پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ غصے میں آگ بگولہ ہو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مزدور اور غریب طبقہ یہ اضافہ کس طرح برداشت کرے گا۔ مجھ سے کہا ہینڈ بل اور پوسٹر کا مضمون تیار کرو، آج ہی یہ چھپنے کے لیے دے دینا چاہیے۔

دفتر کے سامنے المانیک کے نام سے ایک چھوٹا سا پریس تھا جس کو مرغوب بخاری نے قائم کیا تھا۔ مرغوب بخاری بھی جنم جنم کے بے روزگار تھے۔ سکھر سے کراچی آ کر بڑی ٹھوکریں

کھائیں۔اب کہیں سے کچھ رقم کا بندوبست کرکے پریس لگالیا تھا۔ ہینڈ بلز اور پوسٹرز کی چھپائی میں مرغوب بخاری نے بڑی مستعدی دکھائی۔ رات تک دونوں چھپ کر تیار ہو گئے تھے۔اُدھر اخبارات میں پریس ریلیز دینے کے لیے ہم لوگ نکل پڑے۔ کام کا ایسا ہنگامی انداز کبھی نہیں دیکھا۔ رات کو12 بجے شہر بھر میں پوسٹر لگانے کا پروگرام بنا۔کئی ٹیمیں بنائی گئیں۔ ایک ٹیم میں ناصر نے مجھے اور میر عالم کو اپنے ساتھ کرلیا۔ میں نے پوسٹرز اُٹھائے ، میر عالم نے لئی کا ڈبہ پکڑا تو ناصر نے کچھ پوسٹرز خود بھی لے لیے۔ ہم لوگوں کو صدر کا علاقہ کرنا تھا۔ ریگل چوک سے ایمپریس مارکیٹ اور نظامی روڈ بہت اہم علاقہ تھا۔ رات کے 12 بجے سے کام شروع کیا۔ دیواریں اُونچی تھیں،کوئی سیڑھی یا اسٹول دستیاب نہیں تھا۔ ناصر نے مجھ سے کہا تم میرے کندھوں پر چڑھ جاؤ، مجھے کچھ ہچکچاہٹ اور تذبذب ہوا تو کہنے لگے۔ارے بھئی سوچ کیا رہے ہو آ جاؤ اوپر اور یوں میں نے ناصر کے کندھوں پر چڑھ کر پوسٹرز لگائے۔ صبح کوئی ۴ بجے ہم نے پورا ایریا مکمل کیا۔ ناصر بہت خوش تھے اور کہہ رہے تھے اب صبح جب لوگ اس پوسٹر کو دیکھیں گے تو NAP سے اُن کی ہمدردیوں میں اضافہ ہوجائے گا۔ ہم نے بہت بڑا کام انجام دیا ہے، تم سب لوگ مبارکباد کے مستحق ہو۔ کہہ رہے تھے کہ ایک سچے انقلابی کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی سماجی ناانصافی کے خلاف فوراً ردِعمل کا اظہار کرتا ہے اور آواز بلند کرتا ہے چونکہ وہ باشعور ہوتا ہے اور ہراول کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ اُس کا ایک تاریخی کردار ہے جس کی بناپر وہ تمام طاقتوں سے خود کو ممتاز رکھتا ہے۔ ہم نے اپنا کام انجام دے دیا اب دن کے وقت ہینڈ بل، تقسیم ہو جائیں گے پھر دیکھیں گے کہ کس میں ہمت ہے کہ کرایوں میں اضافہ کرے۔ ہم دفتر پہنچے، نہادھو کر چائے اور پاپے کھائے اور دریوں پر دراز ہو گئے۔

دوپہر کے بعد ہینڈ بل تقسیم کرنے پر لوگوں نے خوشی اور گرمجوشی کا اظہار کیا۔ ہمارے اس اقدام کو بہت سراہا اور کہنے لگے یہ پارٹی صحیح معنوں میں عوام دوست پارٹی ہے۔ دفتر میں بھی دوستوں کے ٹیلی فون آنے لگے اور کہنے لگے بہت صحیح وقت پر بہت صحیح فیصلہ کیا ہے۔

ہینڈ بل اور پوسٹر کا مضمون کیا تھا پوری طرح یاد نہیں ہے لیکن اس میں دھمکی دی گئی تھی کہ اگر کرایوں میں اضافے کا فیصلہ واپس نہ لیا گیا تو تمام مزدور اور محنت کش سڑکوں پر آ جائیں گے۔ ہم نے ہینڈ بل اور پوسٹر کی ایک ایک کاپی اخبارات کو بھی روانہ کر دی تھی۔ دوسرے دن اخبارات میں احتجاج کی خبریں بھی آ گئیں۔

تین چار دن کے بعد وہ خبر بھی آ گئی جس کا ہمیں انتظار تھا، بسوں کے کرایہ میں اضافے کا فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ اب کیا تھا ہم لوگوں نے دفتر میں خوب اُودھم مچایا اور خوشی سے ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ ناصر نے فوراً مٹھائی منگائی اور کہنے لگے، دیکھو ہم اگر غفلت کرتے اور فوری اپنے ردعمل کا اظہار نہ کرتے تو یہ کامیابی کسی اور پارٹی کے سر جاتی اور ہمیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

ناصر کا ایک طریقہ کار یہ بھی تھا کہ وہ شہر بھر میں ہونے والے کسی بھی پارٹی کے جلسے میں مجھے لے کر پہنچ جاتے۔ اور ہم لوگ جلسے کے کسی تاریک گوشہ میں کھڑے ہوکر پورا جلسہ سنتے۔ اس سلسلے میں ناصر کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں جلسہ کی تمام کاروائی اور تقاریر کو سننے اور دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے، اس طرح ہم اخبارات کی رنگ آمیزی اور جانبداری کے عمل سے بچ جاتے ہیں جلسے میں حاضرین کی تعداد اور اُن کا ردعمل بھی دیکھنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ جلسے کی تقاریر کے دوران ناصر آہستہ آہستہ دلچسپ فقرہ بازی بھی کرتے جاتے۔ ایک دفعہ ہم ایک مسلم لیگ کے جلسے میں پہنچ گئے۔ ایک معروف خاتون جو آنکھ ناک کی موزوں بھی تھیں۔ جوش خطابت میں کہہ رہی تھیں کہ کشمیر کو آپ فتح نہیں کر سکتے۔ آپ میں نہ تو ہمت ہے اور نہ ہی جذبہ۔ لائیں ہمیں بندوقیں دیں ہم کشمیر کو فتح کر کے دکھاتے ہیں تو ناصر آہستہ سے کہنے لگے بندوقوں کی کیا ضرورت ہے، آپ کا دیکھ لینا ہی کافی ہے!

ایک دن دفتر میں لانڈھی کے مزدوروں کا ایک وفد ناصر سے ملنے کے لیے آ گیا اُنھوں نے یہ خوشخبری دی کہ لانڈھی میں مزدوروں نے چندہ کر کے اور اپنی مدد آپ کی بنیاد پر داؤد چورنگی کے پاس ایک کمرہ تعمیر کرلیا ہے جس کو NAP کے دفتر کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ ناصر سے انھوں نے درخواست کی کہ اس کا افتتاح خود حسن ناصر کریں اور انھوں نے ناصر کی آمدورفت کا بھی انتظام کرلیا تھا۔ ناصر بہت خوش ہوئے اُنھیں مبارکباد دی اور کہا کہ آپ لوگ جا کر تیاریاں کریں۔ ہم کل شام کو پہنچ جائیں گے۔ دوسرے دن میں اور ناصر بذریعہ ٹرین لانڈھی پہنچے۔ تمام مزدور اکھٹے ہو چکے تھے۔ ناصر کو دیکھ کر سب نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ناصر نے دفتر کا فیتہ کاٹا اور مختصر سی تقریر کی، یہ کمرہ آج بھی موجود ہے لیکن اس پر NAP کا بورڈ موجود نہیں ہے۔

ناصر سے اجازت لے کر میں تین چار دنوں کے لیے گھر گیا، کچھ ذاتی کام انجام دینے تھے اور نوکری کے لیے انٹرویو دینے تھے۔ واپس لوٹا تو ناصر دفتر میں پریشان بیٹھے تھے۔ مجھ سے

نوکری کے بارے میں معلوم کیا، میں نے بتایا کہ کچھ نہیں ہوا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے۔ میں نے چند فیصلے کئے ہیں، تمہیں پارٹی کا ممبر بنا رہا ہوں، تم میرے کوریئر (پیغام رساں) کا کام انجام دو گے۔ یہ بہت اہم ذمہ داری ہے میں نے تمہارا خوب جائزہ لے لیا ہے۔ ہر طرح سے آزمالیا ہے، تم میرے معیار اور اعتماد پر پورے اُتر رہے ہو۔ یہ سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں فرطِ جذبات میں اُٹھ کر ناصر سے بغل گیر ہوگیا۔ میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے۔ مجھے دفعتاً یاد آیا کہ پاکستان آنے سے قبل بمبئی میں ناصر خود ڈاکٹر ادھیکاری، جو روپوش تھے، کے کوریئر تھے اور اب میں ان کا کوریئر بننے جارہا ہوں۔ یہ کس قدر بڑا اعزاز ہے۔

ناصر کہہ رہے تھے کوریئر شپ کے چند بنیادی اصول ہیں جن پر کاربند رہنا بہت ضروری ہے۔ میں ان کو وقتاً فوقتاً تمہیں سمجھاتا رہوں گا فی الحال ۳ باتوں کی سختی سے پابندی کرو۔ پہلی بات وقت کی پابندی کرو، دیر کی صورت میں صرف پانچ منٹ دیے جاسکتے ہیں۔ دوسری بات پیغام کو بالکل میکانکی Mechanical انداز میں دوسرے تک پہنچایا کرو، اس میں کوئی کمی بیشی بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ تیسری بات رازداری اور احتیاط ہے۔ اس میں کسی قسم کی چوک بہت بڑی مصیبت پیدا کرسکتی ہے۔ تمہیں لوگوں سے (کارکنوں) سے دو طرح کے رابطے رکھنے ہیں۔ کچھ لوگوں سے تم میرے نمائندہ کی حیثیت سے جا کر ملو گے جنہیں میں اطلاع دے چکا ہوں اور کچھ سے تم اپنی ذاتی حیثیت میں ملتے رہو گے جیسے کہ تم کرتے رہتے ہو۔ جن سے تم میری طرف سے ملو گے ان کے نام یاد رکھ لو۔ ملک نورانی، انیس ہاشمی، پوہول، میجر محمد اسحاق، پروفیسر یحیٰی سلام اللہ خان، ملک شیر افضل، زین الدین خان لودھی، رحمت علی، محمد علی ملباری، سمیع داد خان، علی جان، ماسٹر افضل، کامریڈ قادر بخش نظامانی، کامریڈ نارائن داس بیچر، اسحاق کاشمیری، انیس احمد ایڈووکیٹ، پروفیسر فضل اللہ، فاطمی، کامریڈ محمد زبیر، واحد بشیر، وہاب کانپوری، اقبال احمد خان۔ جن لوگوں سے اپنی ذاتی حیثیت میں ملا کرتا تھا اُن کی فہرست بہت طویل ہے۔ چند ایک نام یہ ہیں: طالب علم رہنما محمد شفیع، معراج محمد خان، جوہر حسین، لانڈھی کے ورکر رزاق میکش، حبیب بغدادی، حاجی عدیل، مسلم عقیل، عبدالستار، ڈرگ روڈ کے محبوب علی، شرف الدین، منگھوپیر کے مرتضٰی اور عبدالوہاب۔ پیر کالونی کے عبدالسلام، لیاقت حسین، ڈاکٹر ودود، حیدرآباد کالونی کے امیر الدین نثار، مسعود سکندر بیگ، ابوسعید، عبدالقیوم، نصیر الدین، اسماعیل یوسف۔

ناصر کہہ رہے تھے ملکی سیاسی صورتحال بہت کشیدہ ہوتی جارہی ہے۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کا صفایا ہوگیا ہے وہاں پروگریسو طاقتیں غالب آ گئی ہیں اور ادھر مغربی پاکستان میں بھی NAP ایک بہت بڑی طاقت بن کر سامنے آ گئی ہے۔ رجعت پسند طاقتیں اس صورتحال کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کریں گی۔ ہمیں بہت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے میں اپنے رابطوں کو کم کررہا ہوں۔ اب میرے پاس بہت اچھی ٹیم بن گئی ہے۔ اب کام کو ڈی سنٹرلائز کرکے کرنا چاہیے۔ ناصر کی ٹیم میں زین الدین خان، ڈاکٹر شیر افضل، سمیع داد خان، محمد فصیح شامل تھے جو اُن سے اکثر ملاقات کرتے تھے۔ میں ناصر کا مزاج شناس ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ناصر کی پیشانی پر ایک نس اُبھر کر بہت نمایاں ہوگئی تھی۔ ہم گفتگو کررہے تھے کہ سوبھو گیان چندانی آ گئے۔ ناصر اُن کے ساتھ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

دفتر میں کبھی کبھار نازش بھی آ جایا کرتے تھے۔ وہ ادیبوں اور شاعروں میں کام کرتے تھے۔ اُنھیں سانس کا ایک بہت موذی مرض ہو چکا تھا۔ زیادہ چلنے پھرنے سے اُن کی سانس پھول جاتی تھی۔ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے رکن تھے۔

پارٹی کے پانچ محاذ تھے۔(۱) سیاسی محاذ، (۲) طلبہ محاذ، (۳) مزدور محاذ، (۴) ادبی و ثقافتی محاذ، (۵) ہاری کمیٹی۔ یہ تمام محاذ اپنی بھرپور سرگرمیوں کا مظاہرہ کررہے تھے اور اپنی اپنی جگہ کامیاب جدوجہد کررہے تھے۔

۱۹۵۶ء کا آئین پاس ہو چکا تھا۔ گورنر جنرل غلام محمد کی جگہ میجر جنرل اسکندر مرزا صدرِ پاکستان کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوئے۔ حسین شہید سہروردی کی حکومت ڈگمگانے لگی۔ بغداد پیکٹ کے خاتمے، شہری آزادیوں کی بحالی اور آزاد خارجہ پالیسی کے پروگرام ملک پر قابض نوکر شاہی اور امریکی مفادات کا تحفظ کرنے والے ٹولے کی قبولیت حاصل نہ کر سکے اور آنِ واحد میں ایک دوسرے وزیراعظم آئی آئی چندریگر سامنے آئے۔ وزارتِ عظمیٰ میں چہروں کی تبدیلی ایسی تیزی سے عمل میں آتی رہی کہ وزیروں کے ناموں کا تسلسل ذہن میں پوری طرح برقرار نہیں ہے۔

غالباً ۱۹۵۷ء میں پارٹی نے بلدیاتی انتخاب میں گولیمار، فردوس کالونی، وحید آباد اور پیر آباد وغیرہ سے اپنا نمائندہ سراج الحق عثمانی کو نامزد کیا جو محمود الحق عثمانی کے چھوٹے بھائی تھے۔ گولیمار مین روڈ پر NAP کے ایک دفتر کی شاخ قائم ہوئی اور مجھے وہاں بٹھایا گیا۔ اس کی تفصیل

میں نے کامریڈ شرف علی کے تعارف میں بیان کردی ہے۔ اس عرصہ میں حسن ناصر نے مرکزی دفتر سے خود کو دور رکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اپنے کمرے سے انھوں نے اپنا سامان اُٹھالیا تھا۔ محمد فصیح دفتر میں پابندی سے بیٹھنے لگے تھے جبکہ ناصر دن کے وقت ایک دو بار دفتر کا چکر لگالیا کرتے۔ گولیمار کے دفتر میں بھی وہ کبھی کبھار پہنچ جاتے، میری ان سے ملاقات ناظم آباد کے علاقوں میں رات کے وقت ہوا کرتی۔

ملکی سیاست میں چلنے والی تند و تیز ہوائیں کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہورہی تھیں۔ ناصر کی گفتگو سے بھی ایسے اشارے مل رہے تھے۔ پارٹی نے اس طوفان کا قبل از وقت اندازہ لگا کر مستقبل کی حکمت عملی طے کرلی تھی۔ ناصر نے بمعہ اپنے ۳ دیگر ساتھیوں کے روپوش ہوجانے کا فیصلہ کرلیا۔ جن میں عزیز سلام بخاری، شرف علی اور امام علی نازش شامل تھے۔

بالآخر ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک کا پہلا مارشل لا نافذ ہوگیا اور ایوب خان پہلے اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور پھر صدر مقرر ہوگئے۔ پورے ملک میں گرفتاریاں شروع ہوگئیں، سینکڑوں سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ناصر اور اُن کے ساتھی اپنی شاندار حکمت عملی اور سیاست کی بہترین نباضی اور حالات کے کامیاب تجزیہ کی بنا پر محفوظ رہے۔

NAP کے مرکزی دفتر کو فوج کے کچھ آدمیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ چوکیدار میر عالم فجر کی نماز پڑھنے کے لیے دفتر کو بند کرکے چلا گیا تھا، جب وہ واپس آیا تو اس سے دفتر کی چابیاں مانگی گئیں۔ اس نے انکار کردیا تو فوجی برافروختہ ہوگئے اور کہا کہ ہم تم کو گولی ماردیں گے، وہ پرانا خدائی خدمت گار کہنے لگا ماردو ہم گولی سے نہیں ڈرتا۔ ہم چابیاں اس کے مالک کو دے گا۔ اُنھوں نے پوچھا مالک کون ہے تو اس نے کہا عثمانی صاحب، محمود الحق عثمانی صاحب سے فون پر بات کروائی گئی اُنھوں نے میر عالم کو چابیاں دینے کے لیے کہا۔ جب جاکر دفتر کو سیل کردیا گیا۔ میر عالم واپس اپنے گاؤں چلا گیا۔ شہر میں خوف دہشت کی فضا طاری ہوگئی۔ سڑکوں کی صفائی اور دھلائی شروع ہوئی، دکانوں پر اشیاء کے نرخ آویزاں کروائے گئے۔ ہوٹلوں میں چائے کی قیمت کم کروائی گئی۔ ٹریفک کی روانی کو بہتر کرنے کا کام کیا گیا اور خوف و دہشت کو مزید گہرا کرنے کے لیے لوگوں کو سڑکوں پر مُرغا بنانا شروع کیا۔ پولیس غائب تھی ہر طرف فوجی بوٹوں کی ٹھک ٹھک سنائی دیتی تھی۔ رات کو صدر ایوب نے قوم سے خطاب کیا اور خوشخبری دی کے فوج نے ملک کو تباہی سے بچالیا۔

اسکندر مرزا کو معزول کر دیا گیا۔ ہر شہر میں مارشل لا کورٹس قائم کر دیے گئے اور اخبارات میں مارشل لا کے ضابطوں کی ایک طویل فہرست بھی شائع ہوئی جس میں تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرتے ہوئے خلاف ورزی کرنے والے کو ۱۴ سال قید با مشقت کی سزا تجویز کی گئی۔

خوف اور دہشت کا ماحول زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا۔ لوگ آہستہ آہستہ اپنے معمولات پر واپس آنے لگے۔ اب ہوٹلیں پھر آباد ہونے لگیں۔ سیاسی کارکن اپنے اپنے علاقوں کے چائے خانوں کا رُخ کرنے لگے۔ ناصر سے ملاقات کیے ۳ ماہ گزر گئے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ایک رات ۸ بجے کسی نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا میں باہر نکل آیا۔ ایک خان صاحب کرتا شلوار اوپر سے کوٹ اور پٹھانی طرز کی ٹوپی پہنے چھوٹی سی داڑھی کے ساتھ مسکراتے میرے سامنے کھڑے تھے۔ میں مسکراہٹ سے پہچان گیا۔ میں گرم جوشی سے ہاتھ کھینچتا ہوا گھر میں آ جانے کے لیے کہا۔ کہنے لگے کچھ گرم پہن لو، باہر ہی چلتے ہیں۔ ہم ناظم آباد کی گلیوں میں چلتے رہے، سردیاں شروع ہو گئی تھیں، ہلکی ہلکی خنک ہوا میں چہل قدمی بڑی پُر لطف تھی۔ ناصر نے گفتگو شروع کی اور کہا ہم لوگوں کے روپوش ہو جانے کا مقصد جان بچا کر چھپتے پھرنا نہیں ہے۔ اس سے بہتر تو گرفتار ہو کر جیل میں پڑے رہتے۔ ہمارا مقصد تحریک کو جاری رکھنا اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تیزی لانا ہے۔ جب تک عوام میں ہر طرف تبدیلی کی خواہش بیدار نہیں ہوتی۔ جب ہم یہ کر چکے ہوں گے تو ہمارا اگلا کام تبدیلی کے عمل کی تکمیل ہوگا۔ یہ زیادہ منظم اور طاقت کے ذریعہ انجام دینا ہوگا۔ ہم ابھی جمہوریت کی بحالی کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دُنیا کی قوموں سے بہت پیچھے ہیں، اُنھوں نے یہ مرحلہ بڑی قربانیوں سے طے کر لیا ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں جمہوریت کے حصول کے لیے ایسی ہی جدوجہد کرنی ہوگی۔ اس عرصہ میں ہم لوگ حالات کا جائزہ لے رہے تھے، پھر اپنے حلیوں کو بھی تبدیل کرنا تھا۔ ناصر کہتے چلے جا رہے تھے، ماحول کی خنکی میں ناصر کی گفتگو سے گرمی پیدا ہو رہی تھی۔ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دینا ایک بزدلانہ عمل ہے۔ آخری ہتھیار ہے جو استعمال کر لیا گیا۔ اب اس کا زور ٹوٹنا شروع ہو گیا ہے۔ ہر وہ چیز جو اوپر جاتی ہے اُوپر جانے کی طاقت ختم ہو جانے کے بعد نیچے آنے لگتی ہے۔ بہت جلد عوام اس کے خلاف صف آرا ہوں گے۔

ہم آبادی سے بہت دور نکل گئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا، چلنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ ناصر ایک جگہ رک گئے، میں نے پوچھا آپ کو میرے گھر کا پتہ کیسے ملا۔ کہنے لگے چند دن قبل میں

اعزآز کے ساتھ تمہارے گھر تک پہنچا تھا۔ رات کافی ہوگئی تھی اس لیےتم سے ملاقات نہ کر سکا۔ ناصر نے اگلی ملاقات کا دن، وقت اور جگہ طے کیا اور اسی اندھیرے میں آہستہ آہستہ غائب ہوگئے۔

میں اپنے پروگرام کے مطابق بتائی ہوئی جگہ پر ٹائم کی پابندی کرتے ہوئے پہنچ گیا۔ یہ حسین ڈی سلوا کا ویرانہ تھا، یہ جگہ ایک وسیع میدان پر مشتمل تھی۔ مکان ابھی بننے شروع نہیں ہوئے تھے۔ ان کی حلقہ بندی ہورہی تھی کہیں کہیں دو چار مزدور جھکے ہوئے کام کرتے نظر آئے۔ ناصر اپنے اُسی حلیہ میں تھے اُنھوں نے دھوپ کا چشمہ لگالیا تھا جس سے ان کی پہچان مزید مشکل ہوگئی تھی۔ ہمیں قصبہ کالونی کو پار کر کے علی گڑھ کالونی جانا تھا جہاں ماسٹر افضل رہائش پذیر تھے۔ میں ان سے واقف تھا یہ خیر پور ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے تھے۔ وہاں سے نکالے جانے کے بعد کراچی آ گئے تھے اور باوانی میں کام کرتے تھے، یہ دو بھائی تھے، چھوٹے بھائی کا نام عبدالوہاب تھا۔ دونوں بھائی ٹیکسٹائل کے پُرانے اور تجربہ کار کاریگر تھے، ان کی اسی مہارت پر لوگ انھیں ماسٹر کہتے تھے۔ ماسٹر افضل اپنے کھاتے کے انچارج بھی تھے۔ ٹریڈ یونین کا وسیع تجربہ رکھتے تھے، علیگڑھ کالونی جھونپڑیوں پر مشتمل تھی جسکی اکثریت علی گڑھ سے تعلق رکھتی تھی۔ ناصر سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ مزدوروں کے مسائل پر بات کی اور مارشل لاء کے سلسلے میں اُن کے ردِعمل پر گفتگو کی، میں انھیں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ گردوپیش کا جائزہ لیا، دور دور تک جھونپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ صفائی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بچے زمین پر بیٹھے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ اسکول یا شفاخانہ یہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ پینے کے پانی کا بھی کوئی نلکا نظر نہیں آیا۔ میں گھوم گھام کر واپس آیا تو ناصر مسکرا رہے تھے۔

شام کے کھانے پر روک لیا، ۷ بجے شام کو رات کا کھانا کھالیا جاتا تھا۔ یہ تقریباً تمام مزدوروں کا طریقہ کار تھا۔ دال اور چاول ہم لوگوں نے کھائے۔ ناصر نے دال کی بڑی تعریف کی اور کہا کہ شمالی ہند کے لوگ دال بڑی مزیدار بناتے ہیں۔ اس پر ماسٹر افضل نے کہا آپ لوگوں کی کھٹی دال تو بہت مشہور ہے۔ ناصر نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کامریڈ ایک دن آپ کے لیے اپنے گھر سے کھٹی دال پکوا کر لے آئیں گے۔ پان کھانے کے بہت عادی تھے۔ ان کی اہلیہ تھوڑی تھوڑی دیر سے ایک تھالی میں پان کی گلوریاں بنا کر بھیجتی رہیں۔ اندھیرا ہونے لگا تھا، ہم لوگوں نے واپسی کا قصد کیا۔ بستی میں مٹی کے تیل کے دیے جلنے لگے۔ ماسٹر افضل ہمیں چھوڑنے کے لیے باہر

نکل رہے تھے تو ناصر نے منع کر دیا۔ ہم چپکے سے نکل آئے اور واپسی کے لیے دوسرا راستہ منتخب کیا۔ راستے میں ناصر نے مجھے روک کر اگلا پروگرام طے کیا اور چلے گئے۔ میں پیدل چلتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ راستے میں ٹھنڈی ہوائیں شروع ہوگئی تھیں، لیکن پیدل چلنے سے جسم میں گرمی آ گئی تھی۔

اس طرح ہم نے ہر روز ایک مزدور کارکن سے رابطہ کرنے کا پروگرام انجام دیا جن کارکنوں سے ملاقاتیں کیں اُن میں چند اہم یہ لوگ ہیں: علی جان، مرتضیٰ، رحمت اللہ، عبدالغفار۔ یہ لوگ منگھوپیر کی مزدور تحریک میں پارٹی کی نمائندگی کرتے تھے اور پارٹی کی پالیسیوں کو مزدوروں میں متعارف کروانے اور مقبول بنانے کا کام انجام دیتے تھے۔ یہ اپنی اپنی ملوں کے سرکردہ رہنما بھی تھے۔

چچا علی جان کے گھر گئے تو وہاں امام علی نازش سے ملاقات ہوگئی جو بخار میں مبتلا تھے اور موسم کی تبدیلی سے ان کے مرض میں شدت آ گئی تھی۔

منگھوپیر کی مزدور بستی میں پارٹی نے ایک مفت شفا خانہ بھی کھول لیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر غالب بیٹھا کرتے۔ ڈاکٹر غالب کو میں خیر پور سے جانتا تھا، جہاں ان کی پوسٹنگ تھی۔

منگھوپیر کے ورکرز سے ملاقات کے بعد ناصر نے لانڈھی کے مزدوروں سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے کامریڈ زبیر کو لانڈھی جا کر اطلاع کر دی اور ہم لوگوں کی آمد کی تاریخ سے مطلع کیا۔ پروگرام یہ تھا کہ ہم کراچی سے پیدل چل کر لانڈھی جائیں گے اور شہر کے باہر باہر سے چلیں گے۔ اُن دنوں کراچی شہر پاپوش نگر کے بڑے میدان پر ختم ہو جاتا تھا، جہاں تمام بسیں آ کر رُک جاتی تھیں۔ دوسری طرف ناظم آباد ہمدرد دواخانے کے بعد تمام ہو جاتا تھا۔ ہمیں ویران علاقوں سے گزرنا تھا۔ ناصر نے میری طرف دیکھا۔ کیا ارادہ ہے میں نے کہا میں پیدل چلنے کا کافی عادی ہوں، مجھے آپ کی فکر ہے، کہنے لگے جب سے روپوشی اختیار کی ہے، پیدل ہی چل رہا ہوں۔ میں بھی عادی ہو گیا ہوں۔ بس ہمت کرو علی الصبح نکل جائیں گے۔ ہم نے دوسرے دن صبح 6 (چھ) بجے روانہ ہو جانے کا پروگرام بنایا۔ ناصر صبح ٹھیک 6 (چھ) بجے میرے گھر ناظم آباد نمبر ایک پہنچے، میں باہر نکل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ساتھ میں کچھ سینڈوچ رکھ لیے تھے تاکہ دوپہر کو کام آ سکیں۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ہم ایک ویران سے میدان میں پہنچ گئے جہاں آبادی کے کوئی نشان نظر نہیں آتے تھے۔ ہر طرف خاردار جھاڑیاں تھیں، ناہموار زمین تھی اگرچہ کہ صبح تھی لیکن ریت

اُڑنے لگی تھی۔ ناصر اپنے روایتی پٹھانی حلیے میں تھے، کندھے پر ایک رومال اور رکھ لیا تھا۔ میں نے بھی شلوار کرتا پہن لیا تھا۔ ہم نے جو راستہ اختیار کیا وہ آج کے نقشے کے مطابق بفرزون، سہراب گوٹھ، گلشن اقبال، گلستانِ جوہر، کراچی ایئرپورٹ کے پشت سے ہوتے ہوئے ملیر سٹی کے عقب پہنچ کر ملیر ندی کے سیدھے جانب معین آباد کی بستی کی پشت پر پہنچنا تھا۔ یہ ایک طویل اور بڑا دلچسپ ایڈونچر تھا۔ اب سورج کی تمازت بھی بڑھ گئی تھی اور ریت کے بگولے بھی بننے لگے تھے، ہوا کے جھکڑ کے ساتھ جھاڑیوں کا ٹوٹ کر بکھرنا بھی شروع ہو گیا تھا۔ راستے میں ہمارے قدموں کی چاپ سے ڈر کر چھپکلیاں اور گرگٹ دوڑنے لگتے تھے۔ ناصر نے کچھ پتھر اُٹھا لیے اور گرگٹوں کو نشانہ لگانے لگے۔ پتھر کی آواز کے ساتھ یہ اپنے اگلے قدم پر کھڑا ہو جاتا اور اپنا رنگ سرخ کر لیتا تھا۔ گرگٹ اس جارحانہ انداز پر ناصر نے بڑی دلچسپ گفتگو شروع کی اور کہا کہ دیکھو یہ ڈر کر بھاگتا نہیں ہے بلکہ سینہ تانے کھڑے ہو جاتا ہے۔ اس کا رنگ بدل کر سرخ ہو جانا غصے کے اظہار کا طریقہ ہے۔ اس جاندار کی نسل کی یہ خصوصیت اس کی بقائے حیات کا باعث ہے۔ کیا تم نے ڈارون کو پڑھا ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ناصر کہہ رہے تھے کہ گرگٹ میں یہ خصوصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ خود کو چھپانے کے لیے ماحول کے مطابق رنگ بدل لیتا ہے خود کو کیموفلاج کر لیتا ہے۔ وہی زندہ رہتا ہے جو زندہ رہنے کے مطابق بن جاتا ہے۔ دوپہر ہوگئی تھی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ سوال یہ تھا کہ بیٹھا کہاں جائے، راستے میں کوئی سایہ دار درخت بھی نہیں تھا۔ ناصر نے کہا اس شہر کا جغرافیہ بھی ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔

راستے میں ایک ٹیلے پر نظر پڑی۔ اس پر کچھ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے یہاں بیٹھ کر سینڈوچ کھانے کا پروگرام بنایا۔ پانی کہیں موجود نہیں تھا، سینڈوچ آہستہ آہستہ نگلے جا رہے تھے، ڈرتے ہوئے کہ حلق میں نہ پھنس جائیں۔ میں سوچ رہا تھا اگر یہ ہم میں سے کسی کے حلق میں پھنس جائیں تو کیا ہوگا، اس خیال کے ذہن میں آتے ہی ایک جھرجھری سی بدن میں دوڑ گئی۔ ٹیلے پر بیٹھے اردگرد کا جائزہ لیا تو دور سے کراچی ایئرپورٹ کا مشہور ''کالا چھپرا'' دھندلا دھندلا سا نظر آنے لگا یہ دور سے ایک بڑی ماچس کی ڈبیہ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کالا چھپرا ایک بہت بلند وسیع و عریض سینکڑوں جست کی چادروں سے تیار کیا ہوا جہازوں کی مرمت کا ورکشاپ تھا جس میں کئی جہاز بیک وقت سما سکتے تھے۔ بلندترین ہونے کی وجہ سے دور دور سے نظر آ جاتا تھا، اب

موجود نہیں ہے۔ میں نے ناصر سے کہا وہ دیکھیں ''کالا چھپرا''۔ ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی، ہم صحیح سمت میں جا رہے تھے اور آدھا راستہ طے کر چکے تھے۔ ہم نے سینڈوچ ختم کیے اور پھر چلنا شروع کیا۔ ناصر کا خیال تھا کہ ہمیں ملیر سٹی کے پیچھے سے جانا ہوگا۔ ملیر سٹی ایک چھوٹا سا دیہات تھا، لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ دو کانیں اور ہوٹل تھے، ایک سینما ہاؤس بھی تھا۔ شاہین سینما جس کی چھت نہیں تھی۔ بسوں کا بڑا اڈا تھا جہاں سے ٹھٹھہ وغیرہ کے لیے بسیں جایا کرتی تھیں، پولیس بھی موجود رہتی۔ اس علاقے سے دور دور ہی چلنا ہوگا۔ شام کا وقت تھا ہم ملیر سٹی کے عقب سے گزرے تو ملیر کے امرود کے باغوں میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر پہلے ہم دوزخ میں تھے، سورج آگ برسا رہا تھا، پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے بن گئے تھے، ببول کی سوکھی جھاڑیاں راستے میں کانٹے بچھا رہی تھیں۔ ہمارے دائیں بائیں حشرات الارض خوفناک طریقے سے دوڑ رہے تھے۔ ریت اُڑ رہی تھی اور آنکھوں میں چبھن ہو رہی تھی۔ ایک دم منظر تبدیل ہو گیا۔ ہر طرف درخت ہی درخت، درختوں کے درمیان سے ٹھنڈے پانی کی ایک نالی نہر کی طرح بہہ رہی تھی۔ اس کا پانی شفاف اور میٹھا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہمارا دل باغ باغ ہو گیا، گویا جنت میں آ گئے۔ جوتے اُتارے، ہاتھ پاؤں دھوئے، سروں پر پانی ڈالا، جی بھر کر پیا، جان میں جان آئی۔ ناصر نے درختوں کے قریب جا کر امرود تلاش کیے، موسم ختم ہو چکا تھا، ایک آدھ امرود لگا نظر آیا جو گل سڑ رہا تھا۔ ہمیں اس جگہ کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ابھی منزل کافی دور تھی، ہم نے ایک بار پھر ہاتھ منہ دھویا اور ملیر کی خشک ندی میں اُتر گئے۔ ندی کے بیچوں بیچ ایک پتلی سی سڑک ہے جو لانڈھی کو شہر سے ملاتی ہے۔ یہ برساتی ندی ہے اور ہر موسم پر یہاں چلنے والی بسیں پانی میں بہہ جاتی ہیں۔ اس وقت ندی خشک تھی اور ریت سے بھری ہوئی تھی۔ ریت میں پیر دھنس جایا کرتے تھے، ہم نے ندی کے اندر سے سیدھے جانب چلنا شروع کیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا، دور سے معین آباد کی جھونپڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے ناصر سے کہا لیجئے ہم بس اب پہنچنے والے ہیں۔ ناصر نے اپنی ٹوپی اور چادر وغیرہ درست کی۔ قریب پہنچ کر میں نے ناصر کو ایک جانب روک لیا اور خود جا کر کامریڈ زبیر کو اپنی آمد کی اطلاع کی۔ کامریڈ زبیر گرم جوشی سے ملے، میری پیٹھ ٹھونکی اور ناصر کی خیریت دریافت کی اور گلی میں نکل کر ایک جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا، یہاں ایک خان صاحب امیر گل نام کے رہتے ہیں، آپ ناصر کو اس جھونپڑی میں لے آئیں۔

امیر گل باچا خان کی سرخ پوش تحریک کا فدائی کارکن تھا جس کی عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ دراز قد اور مضبوط جسم کا سرخ وسفید آدمی تھا۔ میں ناصر کو لے کر اُس کے پاس پہنچا تو وہ ہم سے اس طرح ملا جیسے بہت پُرانی واقفیت ہے، خوشی سے اُسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہماری کیا خدمت کرے، اس نے دری پر چادر بچھائی، تکیے لگا دیے اور چائے بنانے کے لیے بیٹھ گیا۔ ناصر اس کی گرم جوشی اور پھر تیلے پن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور باچا خان کی تعریف میں دو تین جملے کہے۔ جنھیں سن کر وہ مزید فریفتہ ہوگیا۔ چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں چائے لا کر دی جو خالص دودھ میں بنائی گئی تھی۔ بڑی لذیذ چائے تھی۔

رات کا کھانا کامریڈ زبیر نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا، جو کھایا گیا۔ سالن بہت مزیدار تھا پتا چلا کہ کامریڈ پکانے کے بھی ماہر ہیں۔ کچھ دیر بعد کارکنوں کی باری باری ملاقات ہوئی، مختلف ملوں کے کارکن تھے اور پارٹی کے زیرِ اثر کام کر رہے تھے۔ ان میں حبیب الدین بغدادی، رزاق میکش اور حاجی عدیل بھی شامل تھے۔

حبیب الدین بغدادی، چادر گھاٹ ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔ ماچس فیکٹری میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہم لوگوں نے ماچس فیکٹری کی پہلی یونین بنائی تھی جو لانڈھی کی پہلی مزدور یونین تھی۔ یہ مرغی خانے میں (حیدرآبادیوں کی ایک بستی) میرے قریب کی جھونپڑی میں رہتے تھے۔ ان سے ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک دن یہ اپنی جھونپڑی کے باہر ''امروز'' اخبار پڑھ رہے تھے۔ اُن دنوں امروز اخبار مخصوص فکر کے لوگوں میں بہت مقبول تھا، اس کا مطالعہ ان کی سوچ کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں اُدھر سے گزر رہا تھا فوراً رُک کر ان سے ملا پھر ہماری دوستی ہوگئی۔ یہ حیدرآباد ہی سے ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ان کی ایک عادت بڑی مشہور تھی۔ یہ اپنی جھونپڑی میں بے روزگار نوجوانوں کو جمع رکھتے، اُنھیں سیاسی تربیت دیتے اور اُن کی مدد کرنے کے لیے اپنے تمام پیسے نکال کر ایک کونے میں اخبار کے اُوپر ڈال دیا کرتے۔ جس کسی کو ضرورت ہوتی وہ اس میں سے کچھ پیسے لے کر اپنی ضرورت پوری کر لیتا۔ آج کل معین آباد میں کامریڈ زبیر کے ساتھ رہ رہے تھے۔

رزاق میکش۔ حیدرآباد کے شہر بیدر سے ان کا تعلق تھا، ترقی پسند تحریک سے بیدر ہی میں وابستہ ہوگئے تھے۔ ماچس فیکٹری کی پہلی یونین میں ہمارے ساتھ تھے۔ شروع ہی سے معین

آباد میں رہتے رہے۔ کامریڈ زبیر نے ان ہی کی جھونپڑی میں رہائش اختیار کی۔ شاعری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ ابتدا میں یونین کی سرگرمیوں میں شامل رہ کر مزدوروں کی زندگی پر نظمیں کہتے رہے۔ مرغی خانے میں ہم لوگوں نے ''تہذیبی مرکز'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، جس میں ہر ایک رکن کا کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری تھا۔ میکش اس ضرورت کے تحت بھی شعر کہنے لگے تھے۔

حاجی عدیل۔ حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والدین حج کرنے مکہ گئے ہوئے تھے، جہاں یہ پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے ان کا نام حاجی رکھ دیا، عدیل بعد میں شامل ہوا۔ شروع ہی سے معین آباد میں رہنے لگے تھے ان کی جھونپڑی کامریڈ زبیر کے قریب تھی۔ انھوں نے اپنی سیاسی تربیت کامریڈ زبیر سے حاصل کی تھی۔

معین آباد نواب معین نواز جنگ کے نام پر قائم ہونے والی بستی ہے۔ جس کی اکثریت حیدرآبادیوں پر مشتمل ہے۔

رات کافی دیر بعد امیر گل کی جھونپڑی میں ہم لوگ سوئے۔ امیر گل اپنی جھونپڑی کے باہر چارپائی پر ساری رات بیٹھا رہا۔ کامریڈ زبیر کے مطابق اس نے ہماری حفاظت کے لیے اپنا پستول چارپائی پر تکیہ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ صبح کو امیر گل نے وہی لذیذ چائے بنائی اور پاپے ساتھ کھلائے۔

دوپہر کے کھانے کے لیے حبیب بغدادی نے مجھے ساتھ لے لیا، ہم لوگ ''کاکو'' کے مشہور ہوٹل پہنچے۔ کاکو پٹھان تھا لیکن اُس نے باورچی حیدرآبادی رکھے ہوئے تھے۔ ہم نے یہاں سے حیدرآبادی ''پسندے'' اور تندوری روٹیاں لیں، کامریڈ ناصر کے ساتھ سب نے مل کر کھایا۔ ناصر کو حیرت ہوئی کہ حیدرآبادی پسندے کہاں سے آ گئے تھے۔ تفصیل بتائی کہ یہاں ایسا ایک ہوٹل ہے، سُن کر اُس پٹھان کی کاروباری ذہانت کی تعریف کرنے لگے۔

کامریڈ زبیر نے حبیب بغدادی اور رزاق میکش کا نام پارٹی کی ممبر شپ کے لیے پیش کیا۔ ناصر بہت خوش ہوئے اور بہت جلد ان کی کنفرمیشن کی اطلاع دینے کا وعدہ کیا۔ رات کو ہماری واپسی لوکل ٹرین کے ذریعہ ہوئی۔ ٹرین پر ہمیں چھوڑنے کے لیے امیر گل اکیلے آئے، دیگر ساتھیوں نے اسٹیشن پر آنا مناسب نہیں سمجھا۔ امیر گل ہم سے بغلگیر ہوئے اور کہا ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی مجھے یہ جملہ سن کر اُس پر پیار آ گیا۔ وہ ساری رات ہماری حفاظت کرنے کے لیے جاگتا رہا تھا۔ بڑا معصوم انسان تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کے کرتے کے اندر کوئی سخت چیز پوشیدہ ہے۔ ناصر نے

بھی محسوس کیا۔ ۸ بجے شب ٹرین روانہ ہوئی جو بالکل خالی تھی۔ لوگ سیٹوں پر دراز ہوکر جا رہے تھے۔ ناصر بھی ایک سیٹ پر دراز ہوگئے۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکتا رہا کہ ہمیں چنیسر ہالٹ پر ٹرین کو چھوڑ دینا تھا۔ جب چنیسر ہالٹ آیا تو میں نے ناصر کو اطلاع دی، ہم اسٹیشن پر اُتر گئے۔ وہاں سے پیدل چل کر نرسری پہنچے۔ راستے میں ناصر نے لانڈھی میں کامریڈ زبیر کے کام کی بہت تعریف کی، بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ کہہ رہے تھے اب تو لانڈھی سارا ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ میں عنایت اللہ خان سے خود نہیں ملا، ابھی اُسے اور پکا ہونے دو پھر دیکھیں گے۔ یہاں سے ہم نے رکشہ لیا اور ناظم آباد پہنچے۔ اگلے دو دن بعد کا پروگرام بنایا اور اپنی اپنی راہ لی۔

اگلا پروگرام دن کے وقت تھا، ہم پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ایک جھونپڑی نما ہوٹل تھا۔ ہم اس کے اندر گئے، ہمارے سوا کوئی اور یہاں نہیں تھا، ہوٹل کا مالک ایک کونے میں بیٹھا نیم بیدار سا تھا۔ ہمیں دیکھ کر قریب آیا، ناصر نے کہا چائے پئیں گے لیکن ابھی رک جائیں۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر شیر افضل اور زین الدین خان بھی جھومتے جھامتے یہاں پہنچ گئے۔ وہ ناصر کے بتائے ہوئے مقام پر صحیح پہنچ گئے تھے۔ ہوٹل کا مالک پھر ہماری طرف آیا، ناصر نے شیر افضل سے کہا ڈاکٹر صاحب آپ ان کے ساتھ جا کر برتن صاف کروا کر چائے بنوائیں۔ تھوڑی دیر میں چائے تیار ہوکر آ گئی، ہم لوگ چائے پینے لگے۔ سامنے ایک سفید رنگ کی لمبی سی گاڑی آ کر رکی، اندر سے ایک خاتون نکلیں، اُنھوں نے اپنے چشمے کو سر پر بٹھاتے ہوئے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔ اُف کتنی مکھیاں ہیں، پتہ نہیں یہاں لوگ کس طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ہوٹل سے ماچس خرید کر واپس جا رہی تھیں تو ناصر نے سامنے کھڑے ہوئے گدھے کی تعریف شروع کر دی کہ گدھا بڑا معصوم جانور ہوتا ہے۔ بار برداری میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ ہم سب ناصر کی طرف حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ یہ گدھا کہاں سے آ گیا۔ دفعتاً ناصر نے کہا میں نے بدلہ لے لیا، ہم لوگ پھر مزید حیران ہوئے۔ ناصر نے کہا آپ لوگوں نے دیکھا نہیں وہ صرف ہمیں شرمندہ کرنے اور چوٹ کرنے کے لیے آئی تھی۔ بھلا ماچس کی اُس کو کیا ضرورت پیش آ گئی۔ اگر سگریٹ بھی پیتی ہوگی تو لائٹر رکھ سکتی تھی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ گاڑی میں ڈرائیور موجود تھا۔ ماچس اس کے ذریعہ منگائی جا سکتی تھی۔ میں نے گدھے کی تعریف کر کے اُس کے غرور کو توڑ دیا۔ یہ سن کر ہم لوگ قہقہے لگا کر ہنس پڑے۔ اور ناصر کی زود حسی اور برجستگی پر غور کرنے لگے۔

ناصر نے اُن دونوں کامریڈز کو لانڈھی کی روئیداد سنائی اور یہ بتایا کہ ہم لوگ پیدل چل کر گئے تھے۔ میں نے راستے کی کلفتیں بیان کیں، وہ لوگ دنگ رہ گئے اور اس کو ایک کارنامہ بتایا جو انجام پذیر ہوا۔

اب طے یہ ہوا کہ آئندہ شہر کے رابطے شروع کریں گے۔ میر احمد حسن رضوی کے گھر کی ملاقات میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ فیڈرل کیپیٹل ایریا کے گورنمنٹ فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ جو بہت چھوٹا اور صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ وہ AGPR میں ملازم تھے۔ شام کا وقت تھا، وہ گھر پر موجود تھے۔ اُنھیں ناصر سے تخلیہ میں بات کرنی تھی۔ میں گھر کے باہر جا کر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اُن کے بیوی بچے تھے۔ برآمدے میں عورتیں چولہے پر کچھ پکا رہی تھیں۔ میرے لئے اُن کے لیٹرین ہی میں چلے جانا پڑا جو بے انتہا خراب اور بدبودار حالت میں تھا۔ فلش سسٹم نہیں تھا۔ دروازہ بند کر لینے کے بعد تازہ ہوا کا گزر بھی نہیں تھا۔ چھت بہت نیچی تھی، میں سیدھی طرح کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چھت پر جالے اور مکڑیاں بھی لٹک رہی تھیں۔ میں 'بطخ' بنا تقریباً ۴۵ منٹ اس اذیت ناک ماحول میں کھڑا رہا۔ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور سانس اُکھڑنے لگی تھی کہ کامریڈ نے آواز دے کر واپس بلا لیا۔ میری جو حالت دیکھی تو بہت شرمندہ ہوئے۔ اُنھیں اس صورتحال کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے تفصیل بیان کی تو کامریڈ کی شرمندگی اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوا۔ میں نے ہنس کر بات کو ٹال دیا۔

ناصر نے اپنا حلیہ پھر تبدیل کر لیا تھا۔ داڑھی صاف کروا دی تھی، سر کے بال اُتروا دیے تھے اور سر پر لیاقت کیپ اُوڑھ رکھی تھی۔ اگلی ملاقات کا پروگرام بنایا۔ اندھیرا ہو گیا تھا، ہم پہاڑی کے دامن سے باہر نکل آئے اور اپنے اپنے راستوں پر چلے گئے۔

سیاسی سرگرمیوں پر مارشل لاء کی پابندی کی وجہ سے شہر میں کسی قسم کی سیاسی ہلچل موجود نہیں تھی۔ تمام سیاسی پارٹیاں خاموش ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہمارے لیے بھی کسی کام کی گنجائش نہیں تھی۔ تاہم لوگوں میں مارشل لاء کی دہشت اور خوف آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا اور اُس سے نفرت کی ابتدا ہونے لگی تھی۔ پڑھے لکھے لوگ تو چائے خانوں میں مارشل لاء کی برملا مخالفت کرنے لگے تھے۔ ہمارے لیے اس صورت حال کو استعمال کرتے ہوئے اس میں تیزی لانے کی ضرورت تھی جو ہم اپنے رابطوں کو متحرک کر کے پیدا کر سکتے تھے۔ کامریڈ ناصر سے ہم لوگوں نے اس موضوع پر

گفتگو کی۔ ناصر ہم سے قبل ہی اپنا رویہ متعین کر چکے تھے۔ کراچی کارپوریشن میں کونسلرز کے انتخابات بھی قریب آرہے تھے۔ جس میں پارٹی بھرپور طریقے سے شرکت کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور شہر کے گیارہ حلقوں سے اپنے نمائندے کھڑے کرنے کا پروگرام بھی بن چکا تھا۔ کارکنوں کو ان حلقوں میں کام کرنے کے لیے ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ مجھے پیر کالونی اور لالوکھیت کے حلقے دیے گئے۔ جہاں سے انیس احمد ایڈووکیٹ اور علاؤالدین عباسی اُمیدوار تھے، ہمیں دیگر کارکنوں کے ساتھ مل کر ان محلوں میں ووٹرز سے فرداً فرداً ملاقاتیں کرنا تھیں اور اپنے نمائندوں کے لیے اُن کی تائید حاصل کرنی تھی۔ اس کے لیے ہینڈ بلز، پوسٹرز اور بینرز کی معقول تعداد درکار تھی۔ ان تمام لوازمات کی فراہمی ایک مرکز کے تحت زیادہ بہتر طریقے سے کی جاسکتی تھی لیکن چونکے انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہورہے تھے اس لئے ہر اُمیدوار اپنی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر اُنھیں تیار کرنے لئے آمادہ ہوگیا تھا۔ اب ہمارا کام یہ تھا کہ ہم اپنی ٹیم کے ذریعہ ان لوازمات کو بہتر طریقے سے استعمال کریں۔ محلوں میں جاکر کنویسنگ کا کام کرنے لئے پڑھے لکھے اور باشعور کارکنوں کی ضرورت تھی جو طلبہ محاذ نے فراہم کردیے تھے۔ اس طرح کام کے دوران آپس میں ہم آہنگی اور اعتماد کی بہترین فضا پیدا ہوئی۔ ہم لوگ دن رات انتخابی مہم میں مصروف اور مشغول رہے، ہفتہ میں ایک بار جاکر کامریڈ ناصر کو اپنی روزمرہ کارکردگی کی رپورٹ پیش کردیا کرتے۔ شہر میں ہر جگہ سے پارٹی کے مقرر کردہ اُمیدواروں کی کامیابیوں کے امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ کارنر میٹنگز میں لوگوں کی کثیر تعداد میں شرکت اس کا بین ثبوت تھا۔ اگرچہ کہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہورہے تھے لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ کون سی پارٹی کس اُمیدوار کی تائید کررہی تھی۔ NAP تمام قوموں کا ایک متحدہ محاذ تھا جس کی وجہ سے ہمیں تمام قوموں کی تائید حاصل تھی جبکہ محنت کش طبقہ اپنی الگ پہچان رکھتا تھا۔ لانڈھی میں کامریڈ زبیر اور عنایت اللہ خان محنت کشوں کو ان کے اپنے اتحاد کی وجہ سے متحرک کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ ان انتخابات نے مارشل لاء کا زور مزید توڑ دیا تھا۔ فوج کو شہر سے ہٹالیا گیا تھا اور پیراملٹری فورسز کی ڈیوٹی لگادی گئی تھی۔ جو پولنگ اسٹیشنوں تک محدود تھے۔

الیکشن کے دن عوام میں بڑا جوش وخروش دیکھنے میں آیا، بڑی گہما گہمی رہی، لوگوں نے پولنگ اسٹیشنوں میں خود چل کر اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ شام کے ۵ بجے پولنگ ختم ہوئی۔

رات تک غیر حتمی نتائج آنے شروع ہوگئے تھے اور حیرت انگیز طور پر پارٹی کے تمام کھڑے ہوئے امیدوار کامیابی سے ہمکنار ہو رہے تھے۔ دوسرے دن اخبارات میں کامیاب اُمیدواروں کے نام آ گئے تھے۔ پارٹی کے تائید یافتہ ۱۱، امیدوار کامیاب ہوگئے تھے جن میں سے چند نام جو مجھے یاد ہیں اس طرح ہیں۔ پیر کالونی سے انیس احمد ایڈووکیٹ، لالوکھیت سے علاؤالدین عباسی ایڈووکیٹ، صدر سے سمیع داد خان، لانڈھی سے عنایت اللہ خان، رام سوامی سے اسحاق کاشمیری۔ دیگر اُمیدوار پارٹی سے پسِ پردہ منسلک تھے۔

انیس احمد ایڈووکیٹ نے اپنی کامیابی پر کارکنوں کی اپنے گھر پر بڑی پُر تکلف دعوت کی، اپنی تقریر میں کارکنوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اُنھیں ایک معقول رقم انعام کے طور پر تقسیم کرنے کا عندیہ دیا، جس کو ہم لوگوں نے سختی سے مسترد کر دیا اور اس عمل کو ہمارے جذبوں کی توہین قرار دیا۔

کامریڈ ناصر پارٹی کے اُمیدواروں کی اس کامیابی پر بے حد خوش اور کارکنوں کے جذبے واحساسِ ذمہ داری وسیاسی شعور پر اُنھیں مبارک باد دے رہے تھے۔ وہ ہر منتخب نمائندے سے ملے اور مبارک باد دی۔ اگلا مرحلہ چیئرمین شپ کے انتخاب کا تھا۔ پارٹی نے صرف سمیع داد خان کو اس کے لیے منتخب کیا تھا جو چیئرمین کی حیثیت سے بھی کامیاب ہوگئے۔ ناصر کی خوشی میں مزید اضافہ ہوا، انھوں نے انگریزی میں کہا ''رائٹ مین ایٹ دی رائٹ پلیس'' "Right man at the Right place" یہ تنظیم کا بنیادی اُصول ہونا چاہیے، ہماری کامیابی سے ہمارے فیصلوں کی تائید ہوتی ہے۔

کامریڈ ناصر نے اندرون سندھ کے دورے کا پروگرام بنالیا، مجھے اُنھیں حیدرآباد تک چھوڑ کر واپس آنا تھا۔ ہم نے صبح ۱۰ بجے ملیر ہالٹ سے پسینجر ٹرین پکڑی۔ ناصر روایتی سندھی لباس میں ملبوس تھے۔ سر پر سندھی ٹوپی اور کاندھوں پر اجرک اوڑھ رکھی تھی۔ ہدایات کے مطابق دونوں کو ایک ہی ڈبے میں سوار ہونا تھا جبکہ نشستیں دور دور اس طرح تھیں کہ ہم ایک دوسرے کو آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

ٹرین روانہ ہوئی تو ناصر نے سندھی اخبار اپنے چہرے کے سامنے رکھ لیا اور ہر اسٹیشن پر اس عمل کو جاری رکھا۔ ٹرین بہت دھیرے دھیرے ہر اسٹیشن پر رُکتی ہوئی جارہی تھی۔ تقریباً ۲ بجے ہم حیدرآباد اسٹیشن پہنچے۔ ناصر کو یہاں سے کسی دوسرے کامریڈ کے ہمراہ روانہ ہونا تھا۔

ناصر کو میں نے اسٹیشن ہی سے الوداع کیا، واپس کراچی کا ٹکٹ لے کر دوسری آنے والی

ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ خوش قسمتی سے زیادہ دیر انتظار کرنا نہیں پڑا، ایک اور پیسنجر ٹرین آ گئی تھی جس کے ذریعہ میں چنیسر ہالٹ واپس آ گیا۔ ناصر کو اندرون سندھ ۱۵ دنوں تک قیام کرنا تھا۔ اس عرصہ میں ان کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ ہم لوگ زین الدین خان، شیر افضل اور میں ناصر کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا رہے۔ ان ہی دنوں پارٹی میں روسی چینی اختلاف کے مسائل زیر بحث آنے شروع ہوگئے جو پوری دُنیا کے ترقی پسندوں کے بین الاقوامی اتحاد کو زیر وزبر کرنے کا باعث بن رہے تھے۔ ایسے وقت میں کامریڈ ناصر کی راہنمائی کی سخت ضرورت تھی۔ پارٹی کے کارکن ہم سے اپنا مؤقف دریافت کرتے جس پر ہم لوگ کوئی حتمی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

میں گھر پر موجود تھا کہ ناصر نے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ سندھ کے دورے سے خیر وخوبی کے ساتھ واپس ہونے پر میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ناصر کہہ رہے تھے کہ دوستوں کی خواہش تھی کہ میں کچھ دن اور رہ لوں۔

میں نے یہاں شہر کی رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ کارکنوں میں روسی چینی اختلاف کی بحث شروع ہوچکی ہے اور وہ پارٹی کا مؤقف جاننے کے خواہش مند ہیں۔ ناصر نے کہا کہ یہ مسئلہ اندرون سندھ بھی کافی شدت سے سامنے آیا ہے۔ جہاں تک اس پر گفتگو کرنے اور بحث ومباحثہ کرنے کا تعلق ہے، یہ بہت اچھی بات ہے یہ جاری رہنا چاہیے لیکن اہم بات یہ ہے کہ کیا ہم اُس جگہ پر پہنچ گئے ہیں جہاں دُنیا کھڑی ہے۔ میری رائے میں ہم اس اختلاف کے متحمل نہیں ہوسکتے، ہم ایک متحدہ محاذ میں رہ کر جمہوریت کی بحالی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ ہمارا مسئلہ جمہوریت کی بحالی کا مسئلہ ہے۔ دُنیا اس سے گزر کر بہت آگے نکل گئی ہے۔ برصغیر میں صرف ہم اکیلے جمہوریت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں شہر میں اہم کارکنوں سے ملاقات کرکے اُن سے اس پر خود گفتگو کروں گا۔ "Our Party is passing through teething age, we can not think of running at this time." پارٹی ابھی دانت نکالنے کی عمر سے گزر رہی ہے ہم کس طرح دوڑ لگا سکتے ہیں، ہم گفتگو کرتے ہوئے شہر سے دور ویرانے میں آ گئے۔ میں نے کامریڈ ناصر کو روس کے پہلے خلائی سیارے اسپوتنک کی کامیاب پرواز پر مبارک باد دی۔ کہنے لگے پوری دنیا کے بنی نوع انسان اس مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی پیش رفت ہے۔ روس نے اس میدان میں بھی اپنی برتری ثابت کردی۔ پھر کہنے لگے۔ ہم نے

زمین کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔ اب ستاروں پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔

اگلی ملاقات پر ہمیں کامریڈ ناصر کے ایک دوست جو نئے نئے یورپ سے لوٹ کر آئے تھے ملنا تھا۔ جو ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہائش پذیر تھے۔ ناصر نے بشرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ فیلٹ سر پر رکھ لی تھی۔ ہم نے ٹیکسی لی اور سوسائٹی پہنچ گئے۔ مکان بہت بڑا تھا کھڑے گارڈ نے جا کر ناصر کی آمد کی اطلاع دی، تھوڑی دیر میں ہم ویٹنگ روم میں تھے جو کافی آراستہ پیراستہ تھا۔ ناصر بیٹھ کر کچھ بے چینی کا اظہار کر رہے تھے اور اُن کی پیشانی پر مخصوص رگ اُبھر آئی تھی۔ میں نے وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ میں فیلٹ پہن کر کمرے میں بیٹھا ہوں، اُتار سکتا نہیں کہ سر پر بال نہیں ہیں۔ انگریزی تہذیب میں گھر میں داخل ہونے کے بعد فیلٹ اُتار دی جاتی ہے، مجھے اس طرح دیکھ کر "گاودی" نہ سمجھ بیٹھے، چلو میں ایکسکیوز کر لوں گا۔ مجھے ناصر کی اس غیر ملکی تہذیب کی پاسداری پر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔

ناصر کے پاس اخباروں کے پلندے میں ٹائم میگزین میرے ہاتھ لگا، اس کے سرورق پر فیڈل کاسترو کو تقریر کرتے دکھایا گیا تھا، ان کے ہاتھ پر دو گھڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں چونک پڑا اور ناصر سے مخاطب ہو کر اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ ہم دونوں کے پاس کسی کے بھی ہاتھ پر گھڑی نہیں ہے اور ہم بھی ایک تحریک چلا رہے ہیں۔ ناصر مسکرائے اور کہا کہ یہ اس ملک کے قائد ہیں جن کی تحریک ایک ثمر دار درخت بن کر اُبھری ہے۔ ان کا جذبہ ان کی قربانیاں اور ان کی فکر کی سچائیوں نے انھیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ یہ سوشلسٹ معاشرے کے قیام کا اعلان کرنے جا رہے ہیں۔ ایک گھڑی مقامی وقت کے لیے ہے اور دوسری بین الاقوامی رابطوں کے لئے۔ جبکہ ہماری تحریک کا ابھی اکھوا پھوٹا ہے۔ ہماری تحریک مفلسوں اور ناداروں کی تحریک ہے جو پوری طرح ملک بھر میں بھی نہیں پھیلی۔ ہم صرف سندھ کی حد تک منظم ہوئے ہیں، ہمارے وسائل بھی اسی حد تک محدود ہیں۔ گھڑی کے بغیر ہم وقت کی پابندی کر رہے ہیں اور مارشل لاء کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے جذبوں اور قربانیوں کی عکاسی کرتی ہے۔

ہاؤسنگ سوسائٹی سے اگرچہ ہم نے ٹیکسی میں واپسی کی لیکن شہر سے بہت پہلے ٹیکسی کو چھوڑ دیا۔ ناصر نے فیلٹ سر سے اُتار لی اور جیب سے ایک کپڑے کی ٹوپی نکال کر پہن لی اب وہ ایک مختلف حلیے میں تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی مسجد سے یا میلاد سے لوٹ رہے ہیں۔ ناصر کو

حلیہ تبدیل کرنے پر ملکہ حاصل تھا، وہ معمولی سی تبدیلی سے ایک بڑا تاثر حاصل کرلیا کرتے تھے۔ روپوشی کے دوران احتیاط کے اصولوں پر خود بھی پابندی کرتے اور ہم لوگوں کو بھی پابندی کرنے کے لیے اکثر ہدایات دیتے رہتے۔ لانڈری سے دھلے ہوئے کپڑوں کو استعمال کرنے سے پہلے لانڈری کا لگا ہوا مارکہ بلیڈ سے کرید کر مٹادیتے۔ اور کہا کرتے کہ ان مارکوں سے کپڑے دھلانے کی نشاندہی ہوسکتی ہے۔ گھروں کے قریب موچی، نائی، پان کی دوکان اور کریانے کی دوکان کے مالک پولیس کے مخبر ہوسکتے ہیں۔ جبکہ چائے خانوں کے بیرے یہ کام انجام دیتے ہیں۔

کامریڈ ناصر کو کرکٹ کے کھیل سے بے حد دلچسپی تھی، جن دنوں کرکٹ ہورہی ہوتی مجھے بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا۔ میں کرکٹ کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا، نہ کبھی خود کھیلا اور نہ دیکھا۔ میں اس کھیل کو اعلیٰ طبقے کے بےفکرے نوجوانوں کا ایک ایسا کھیل سمجھتا تھا جو سارا دن کھیلا جاتا۔ پانچ دن مکمل ہونے کے باوجود ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوجاتا۔ کامریڈ کے پاس جانے سے پہلے خود کو تازہ ترین صورتحال سے آگاہ رکھنا ضروری تھا۔ میں راستے کی کسی دوکان پر کھڑا ہوکر رواں تبصرہ سنتا اور اپنی ہتھیلیوں پر لکھ لیا کرتا تھا۔ عبدالحفیظ کاردار، فضل محمود اور حنیف محمد کے نام خوب یاد رکھ لئے تھے لیکن ان کی کارکردگی پر مغالطہ ہوجایا کرتا تھا۔ بیٹسمین بولر بن جاتا تھا اور بولر بیٹسمین۔ میں اپنی ہتھیلی سے مدد لیتا ہوا ایک دن پکڑا گیا۔ کامریڈ بہت ہنسے جب جاکر یہ راز کھلا کہ میں کرکٹ سے بالکل نابلد ہوں۔ اُن دنوں ٹرانسسٹر ریڈیو کا رواج ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ بجلی پر چلنے والے ریڈیو ہوا کرتے تھے۔ ''پائی'' یا ''گرینڈک'' خبروں پر مارشل لا کے کارناموں کے سوا کوئی دوسری بات نہیں ہوتی تھی۔ لوگ زیادہ تر فلمی گانے سُنا کرتے تھے۔ یہ گانا ''جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں، تیری رسوائیوں سے ڈرتا ہوں'' بہت مقبول تھا۔ کامریڈ ناصر خود بھی اکثر اس گانے کو گنگنایا کرتے تھے۔

ان دنوں کامریڈ ناصر کافی مطمئن اور خوش تھے کہ انھیں رہائش کے لیے ایک مستقل کمرہ مل گیا تھا۔ مالک مکان ایک بوڑھی خاتون تھیں جنھوں نے ناصر کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ یہ جگہ ناصر نے بہت خفیہ رکھی ہوئی تھی اور کوئی دوسرا اس سے واقف نہیں تھا۔ ورنہ جب تک رہائش نہیں ملی تھی، گلیوں سے گزرتے ہوئے کہا کرتے Water Water every where not a drop to drink

۶ اگست ۱۹۶۰ کی شام چھ بجے ہم پہاڑوں کے دامن میں ملے۔ ہم ٹھیک وقت پر

پہنچ گئے تھے۔ میں نے مختلف کارکنوں سے اپنے رابطوں کی تفصیل بیان کی۔ شہر کی عمومی سیاسی صورتحال بتدریج معمول پر آ رہی تھی۔ کارپوریشن کے انتخابات کے بعد کچھ نئے کارکنوں میں اضافہ ہوا تھا جو پہلے مسلم لیگ اور جماعت کے زیر اثر تھے۔ پارٹی کے حمایت یافتہ کونسلرز نے اپنے گھروں کے اندر ہی چھوٹے چھوٹے دفتر بنا لئے تھے۔ جہاں شام کے وقت وہ خود موجود ہوتے اور اپنے حلقے کے مسائل سے آ گاہی حاصل کرتے، کامریڈ ناصر اس صورتحال سے کافی مطمئن اور خوش تھے۔ مجھے ۸، اگست کو ۸ بجے شام ہمدرد دواخانے کے عقب میں بمعہ زین الدین خان اور ڈاکٹر شیر افضل کے کامریڈ سے ملاقات کرنے کا پروگرام طے ہوا۔ مجھے ڈاکٹر ہارون سے ناصر کے سر کو لگانے والا مرہم بھی لے آنا تھا۔ کامریڈ کے سر میں ڈینڈرف ہو گیا تھا جس کا علاج ڈاکٹر ہارون کر رہے تھے جو اُن دنوں پاکستان کوارٹرز کی گورنمنٹ ڈسپنسری میں بیٹھا کرتے تھے۔ ڈینڈرف کے سلسلے میں ناصر ہنستے ہوئے کہتے تھے، یہ بھوسہ ہے جو بچپن میں دماغ میں جمع ہو گیا تھا، اب باہر آ رہا ہے۔ ناصر میں حسنِ ظرافت بھی کافی موجود تھی۔ اگلے دن میں معمول کے مطابق پیر کالونی کے بس اسٹاپ پر اُترا، سامنے ہی سمیع داد کو کھڑے پایا وہ چہرے سے پریشان لگ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکے اور کہنے لگے کامریڈ ناصر گرفتار ہو گئے ہیں، میں چیخ پڑا وہ کیسے؟ کس نے بتایا؟ سمیع داد نے خاموشی اختیار کر لی اور کہا کہ مصدقہ خبر ہے اب ہم لوگوں کو محتاط ہو جانا چاہیے۔ میں کچھ اور لوگوں کو اطلاع کرنے جا رہا ہوں۔ میں نے اُنھیں روک لیا، ابھی رُک جائیں شام کے اخبار دوپہر ہی کو نکل پڑتے ہیں۔ اُن کا انتظار کر لیں ہم ابھی کھڑے باتیں ہی کر رہے تھے کہ اخبار ''نئی روشنی'' کی آواز کانوں میں پڑی۔ ہم اخبار کی دوکان پر دوڑے اور نئی روشنی خرید لیا۔ سرورق ہی پر کامریڈ ناصر کی گرفتاری کی خبر نظر آ گئی۔ جس میں نیوٹاؤن پولیس کی کامیاب کارروائی کا ذکر تھا۔ زیادہ تفصیل درج نہیں تھی۔ میں نے سمیع داد کو الوداع کیا، کچھ اور کاپیاں خرید لیں اور سامنے جیل کالونی کی جھونپڑیوں میں کامریڈ سلام کے پاس پہنچا۔ وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ میں نے اخبار انھیں تھما دیا اور بتایا کہ ناصر گرفتار ہو گئے، وہ سنتے ہی سرخ ہو گئے اور کہا، یار یہ تو غضب ہو گیا اب کیا کرنا چاہیے آؤ سامنے ہوٹل میں بیٹھتے ہیں۔ میں نے کہا، گھروں سے ایسی کتابیں جو غیر قانونی ہیں، ہٹالی جائیں۔ پورے شہر میں گرفتاریاں ہوں گی۔ اس لئے ہر ایک کو تیار رہنا چاہیے۔ میں نے سلام سے کہا مجھے پروفیسر فضل

اللہ سے شام ہی کو ملنا ہے جو پیر کالونی میں رہتے ہیں، دوبارہ آنے کے بجائے یہاں ہی انتظار کر لیتا ہوں۔ اس پر سلام نے کہا پھر گھر چلو وہاں بیٹھتے ہیں۔ ہم شام تک سلام کی جھونپڑی ہی میں بیٹھے رہے اور مختلف امکانات پر غور کرتے اور اپنے غم والم کا تبادلہ کرتے رہے۔ مجھے ناصر کی باتیں یاد آتی رہیں، اُن کی بتائی ہوئی احتیاطی تدابیر اور پھر ناصر کے مختلف حلیے یہ سب کافور ہو گئے۔ قصۂ پارینہ لگنے لگے۔ کیا کوئی نشاندہی ہوئی ہے، کوئی غداری کی گئی ہے؟ سمیع داد کو کس طرح علم ہوا؟ میرا قیاس یہ تھا کہ جس جگہ ناصر کو جانا تھا اس کے منتظرین میں سمیع داد بھی شامل ہوں گے۔ جب ناصر وقت مقررہ پر نہیں پہنچے تو یہ لوگ ناصر کے گرفتار ہو جانے کا قوی امکان لئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہمارے اندازوں کے مطابق ناصر کی گرفتاری صبح ۱۰ بجے تک عمل میں آ گئی ہوگی۔ یہ ہی وہ وقت ہے جب شام کے اخبار پریس میں چھپنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ ۷ اگست ۱۹۶۰ء ایک انتہائی منحوس دن کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔

میں سلام کو لے کر پروفیسر فضل اللہ کے گھر پہنچا، وہ دفتر سے واپس آ چکے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہا اچھا ہوا جو آپ لوگ آ گئے ہیں۔ دوستوں سے مل کر اپنا غم دور کرنا ہی چاہتا تھا۔ یہ دیکھیں اخبار، انھوں نے ہمیں ''نئی روشنی'' اور ''ایوننگ اسٹار'' پکڑا دیا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ دیر تک خاموشی رہی، میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا، یہ کسی کی مخبری کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ سلام نے میری تائید کی۔ پروفیسر نے کہا اب دوسرا قدم کیا ہوگا ہماری طرف سے اور پھر ''اُن کی'' طرف سے۔ میں نے کہا گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔ آج کی رات بہت اہم ہے۔ ہمارے پاس گرفتار ہو جانے کے سوا دوسرا راستہ نہیں ہے۔ پروفیسر نے کہا کامریڈ آپ اپنا خیال رکھیں۔ میرے خیال میں پورے شہر سے گرفتاریاں کرنا اور خوف و ہراس پھیلانا اُن کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ مارشل لا لگا ہوا ہے وہ مارشل لا کے ذریعہ عوامی خواہشات کی تکمیل کا عندیہ دے رہے ہیں۔ چیدہ چیدہ لوگوں کو پکڑیں گے۔ دفعتاً اپنی کتابوں کے درمیان سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا کہ ہم لوگوں کو بونس بٹا ہے، یہ پارٹی کا حصہ ہے۔ اسے آپ پہنچادیں، میں نے لفافے کو علیحدہ کر لیا، اس طرح رقم مشکوک ہو جاتی ہے اور پیسوں کو جیب میں رکھ لیا جیسے ذاتی استعمال کے پیسے رکھے جاتے ہیں۔ رات کا کھانا ہم لوگوں نے بس اسٹاپ کے ہوٹل میں کھایا اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

کامریڈ ناصر کی گرفتاری کی خبر، جیسے جنگل میں آگ پھیلتی ہے اس طرح پھیلی، ہر شخص غم و

اندوہ سے بدحال ہوا جا رہا تھا۔ شہر کی فضا پر جیسے کوئی آسیب چھا گیا تھا۔ کارکنوں کی بڑی تعداد کو پولیس پکڑ پکڑ کر لے جا رہی تھی اور وسیع پیمانے میں پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ دن بھر تھانوں میں رکھ کر رات کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ جو مرکزی نکتہ سوالات میں پوچھا جاتا تھا وہ ناصر اور اُن کے ساتھیوں کی سرگرمیوں سے متعلق ہوا کرتا تھا۔ اُدھر ناصر کی گرفتاری کے سلسلے میں قیاس آرائیاں بہت زور و شور پر ہو رہی تھیں۔ گرفتاری میں پہلا قیاس تو کسی کی مخبری و غداری کا سامنے آ رہا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ جب ناصر نیوٹاؤن پولیس اسٹیشن کے سامنے سے گزر رہے تھے تو وہاں پولیس نے ناکہ لگایا ہوا تھا اور کسی مفرور مجرم کی تلاش تھی، ہر گزرنے والی گاڑی اور رکشے کو روک کر مسافروں کی شناخت کی جا رہی تھی۔ ناصر کے رکشے کو بھی اُنھوں نے روکا جس پر ناصر برہم ہوئے اور انگریزی، جو وہ انگریزوں کے لہجے میں بولا کرتے تھے، کہا کہ اس طرح آپ لوگ مسافروں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں۔ ناصر کی اس گفتگو پر ایک انسپکٹر نے انھیں غیر ملکی سفارتکار سمجھ کر نام، پتہ اور پیشہ دریافت کیا۔ جس کا ناصر معقول جواب نہ دے سکے جس کی وجہ سے ان کے رکشے کو روک کر سامنے تھانے میں کھڑا کر دیا، وہاں CID انسپکٹر شریف الحسن موجود تھا۔ جس نے انھیں پہچان لیا اور فوراً گرفتار کر لیا۔ مذکورہ انسپکٹر کو ترقی دے کر DSP بنا دیا گیا جس کی تصدیق ہمیں اپنی گرفتاری کے دوران ہوئی۔ ترقی کی بات وہاں CIA سینٹر میں عام مشہور تھی اور وہ اچانک ٹائی لگا کر دفتر میں آنے لگا تھا۔

تیسری قیاس آرائی یہ تھی کہ ناصر جس رکشے میں تھے، اس کے ڈرائیور کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی مفرور شخص ہے جو پولیس سے چھپتا ہوا جا رہا ہے۔ اس نے پولیس سے انعام و اکرام اور ستائش کے لالچ میں رکشے کو تھانے میں لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں انسپکٹر شریف الحسن موجود تھا اُس نے ناصر کو پہچان لیا۔ ان دونوں مفروضوں میں نیوٹاؤن تھانہ اور شریف الحسن کی موجودگی کا تذکرہ ملتا ہے اُدھر اخبار کی خبر میں نیوٹاؤن پولیس کی کامیابی بھی اس بات کو تقویت دیتی ہے۔ ناصر کی گرفتاری کے سلسلے میں یہ بھی ایک سوال ہے کہ کیا ناصر کی گزرگاہ پر پولیس کی کارروائی معمول کا حصہ تھی یا یہ دانستہ طور پر ایک منصوبہ تھا؟

ان تمام مفروضوں کے علاوہ جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ کہ رضا کاظم ایڈووکیٹ جو ہمارے ساتھ گرفتار ہوئے تھے اور انھیں حکومت نے اس بنا پر رہا کر دیا تھا کہ وہ جیل میں ہم لوگوں کی قانونی معاونت کر رہے ہیں۔ لاہور میں اپنے ایک رسالے ماہ نامہ میں سردار عبدالوکیل خان

SSP کا ایک انٹرویو شائع کیا تھا جس میں انھوں نے ہم لوگوں کے ساتھ گرفتار ایک ایسی شخصیت کی طرف اشارہ کیا تھا جو اُن کے مطابق امریکی سفارت خانے سے تعلقات رکھتے تھے۔ ان شخصیت کا CIA سینٹر میں جو رہن سہن تھا، وہ ہم سب نے دیکھا۔ اُن کے گھر سے فرنیچر منگا لیا گیا تھا۔ روز اُن کے بیوی بچے تھانے میں آ کر سارا سارا دن بیٹھے رہتے اور اُن کا کھانا بھی گھر ہی سے آتا تھا۔ وہ پرچہ اب نکلنا بند ہو گیا ہے۔ لیکن رضا کاظم ایڈووکیٹ ابھی بقید حیات ہیں اور وہ اس سلسلے میں کافی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ سردار عبدالوکیل خان کراچی میں CIA کے SP تھے اور ناصر کے کیس کی تفتیش کر رہے تھے۔

کامریڈ ناصر کو کراچی سے لاہور شاہی قلعہ لے جایا گیا جہاں اُن سے اس امر کی تفتیش کی جاتی رہی کہ اُنھوں نے ملک کے بہترین مستقبل کے لیے جمہوریت کی بحالی کی تحریک منظم کی۔ فوجی حکمرانوں کی نگاہ میں یہ جرم قابل گردن زدنی ٹھہرا اور ناصر کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۳ نومبر ۱۹۶۰ء کو کھولی نمبر ۱۳ میں پیش آیا۔ ان کی ہلاکت کے سلسلے میں معروف ماہر قانون جسٹس فخر الدین جی ابراہیم نے ایک T.V انٹرویو میں بیان کیا کہ انھیں پھانسی دے دی گئی تھی۔

ناصر کی والدہ بیگم زہرہ علمدار حسین کو جب اپنے لختِ جگر کی ہلاکت کی خبر حیدرآباد پہنچی تو وہ ایک چارٹرڈ طیارے سے لاہور پہنچیں تا کہ ناصر کی میت کو واپس حیدرآباد لایا جا سکے لیکن انتقام کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔ ناصر کی نعش غائب کر دی گئی اور اُن کی جگہ کسی دوسرے مردے کو پیش کر دیا گیا۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ کا یہ ایسا سیاہ ترین باب ہے کہ اس کی سیاہی ہر لمحہ گہری ہوتی ہوئی مستقل داغ بن کر چہروں پر چھا گئی ہے۔ جبکہ ناصر کی چلائی گئی تحریک کا اُجالا روز روشن کی طرح پھیل کر اٹھارہ کروڑ عوام کی لوح تقدیر پر ہمیشہ کے لیے جگمگاتا رہے گا۔ یہ ناصر کے خون کا اعجاز ہے کہ آج آمروں نے بھی جمہوریت ہی کی پناہ گاہ کو اپنی عافیت کا ٹھکانہ بنا لیا ہے۔

بیگم زہرہ علمدار حسین کے لختِ جگر کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ اس کا ایک ایک قطرہ مشعلِ راہ بن کر پاکستانی قوم کی منزل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اس کی سرخی شفق بن کر ایک نئے سورج کے طلوع ہونے کی نوید دے رہی ہے۔ ناصر کی جمہوریت کی بحالی کی تحریک نے چار آمروں کو ذلیل و رسوا کر کے مسند اقتدار سے اُٹھا کر نیچے پھینک دیا ہے جو کبھی زمین پر اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔

تلنگانہ کا انقلابی

موسم آیا تو نخلِ دار پے میرؔ
سرِ منصور ہی کا بار آیا

"ہم تلنگانے کی آگ لے کر یہاں پہنچے ہیں ظلم و جبر کے ایوانوں کو جلا کر خاکستر کر دیں گے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو حسن ناصر اکثر اپنی گفتگو میں دوہرایا کرتے تھے۔ بچپن کا ناصر حسن جواں ہو کر شعور اور آگاہی کی آگ میں تپ کر کندن بنا اور مارکسزم کا نظریہ حیات اختیار کیا تو حسن ناصر کے نام سے معروف ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر میں سیاسی بیداری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ انگریزوں کی غلامی کے خلاف اور انہیں دیس سے نکالا دینے کے لیے ایک طوفان برپا تھا۔ احتجاجوں کا، ہڑتالوں کا جس میں مزدور، کسان، فوجی جوان، بحریہ اور فضائیہ کے ارکان یہاں تک کہ پولیس بھی ان میں شامل ہو گئی تھی۔ ملوں اور فیکٹریوں کا پہیہ جام تھا۔ ذرائع نقل و حمل منجمد تھے۔ عوام نے سول نافرمانی شروع کر دی تھی۔ فرنگی انتظامیہ مفلوج و ناکارہ ہو کر رہ گئی تھی ہر طرف بے یقینی ہر سمت بے چینی کی فضا، امن و امان تباہ تھا۔ لاٹھی، گولی قید و بند انسانوں کا ایک سیلاب تھا جو گھروں سے باہر سڑکوں پر ہر وقت موجود رہتا۔ حیدرآباد دکن کی صورتحال اس سے بھی کہیں زیادہ دگرگوں تھی جب روس کے بعد تاریخ میں پہلی دفعہ تلنگانے کے کسانوں نے بغاوت کر کے زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ 40 لاکھ انسانوں کسان مزدور سبھاؤں اور کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں ظلم و جبر کے خلاف اپنے حق کو منوانے کے لیے مسلح جدوجہد کی اور تلنگانے کے ایک بڑے حصہ پر اپنی حکومت قائم کر کے پنچائتی نظام رائج کر دیا۔ جیلیں توڑ دیں اور تھانوں پر عوامی کارکنوں نے قبضہ کر لیا۔

تلنگانے کی بغاوت نے پورے ہندوستان کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور پورے ملک میں اس انقلاب کا خیر مقدم کیا جانے لگا۔

کامریڈ مخدوم محی الدین جو ایک مقبول شاعر، دکن کے نوجوانوں کا ایک افسانوی اور طلسماتی کردار اور مشہور کمیونسٹ رہنما تھے اس بغاوت کے روح رواں بن گئے۔ دکن کے تمام پڑھے لکھے نوجوانوں نے مخدوم کی رہنمائی میں انجمن ترقی پسند مصنفین، مارکسسٹ اسٹڈی سرکل، کسان اور مزدور سبھاؤں میں شمولیت اختیار کرنی شروع کر دی۔ نوجوان حسن ناصر جس کا خاندانی پس منظر بھی سیاسی تھا اس صورتحال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے ان سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ ماں باپ اپنے خاندانی وقار وجاہت اور مقتدرانہ حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے بیٹے کو ولایت بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن حسن ناصر حیدرآباد دکن سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچا جہاں کی سیاسی فضا نے اس کے ارادوں کو مہمیز لگائی اور سن 48ء میں کراچی وارد ہوا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

تلنگانے کا انقلابی مارکسسٹ نظریات کا حامل جو پوری دنیا کو اپنا وطن کہتا تھا۔ جس کے دل و دماغ میں بنی نوع انسان کو ظلم اور استحصال سے نجات دلانے کا جذبہ موجزن تھا۔ پاکستان کا محبِ وطن بن کر پاکستان کے مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کا مقبول ترین اور محترم رہنما بن کر ابھرا۔

آج 13 نومبر 2010ء ہے آج ہی کے دن آج سے 50 سال قبل عوامی نفرتوں اور حقارتوں کا مرکز قلعہ لاہور کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ایک 32 سالہ جوان جس کا قد دراز تھا، رنگت جس کی سرخ و سفید تھی، جس کا جسم مضبوط اور توانا تھا، جس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی، جس کی گفتگو ہر آن زندگی کی تلخیوں میں شہد گھولتی، ہر لحہ انقلاب، تبدیلی اور خوشحالی کی پیش بینی کرنے والی آنکھیں اور ان سے ہمکنار ہونے والا عزم پیہم، پیکر ہمت و شجاعت مجسم جرأت و صداقت زندگی کی آخری سانس لے کر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کی مسکراہٹ اجڑ گئی، انقلاب تبدیلی اور خوشحالی کا خواب دیکھنے والی چمکدار آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ سرخ و سفید مضبوط و توانا جسم پہلے زرد ہوا اور پھر آہستہ آہستہ سرد ہو گیا یہ لاش تلنگانے کے انقلابی حسن ناصر کی تھی۔

تھم گیا شور جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چشم زدن میں وہ لاش غائب بھی کر دی گئی۔

نہ دست و ناخن قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخی لب خنجر نہ رنگ نوک سناں
نہ خاک پر کوئی دھبہ نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں ہے لہو کا سراغ

بوڑھی ماں سینکڑوں میل دور سے ایک چارٹرڈ طیارے کے ذریعہ اپنے لخت جگر کی لاش واپس لے جانے کو پہنچی تو اس کی اشکبار آنکھوں نے کچھ اور ہی منظر دیکھا، وہ چیخ پڑی یہ میرے بیٹے کی لاش نہیں ہے۔ یہ وہ چہرہ نہیں ہے جس کو دیکھنے کی آس لیے میں یہاں پہنچی تھی یہ ہونٹ وہ نہیں ہیں جنہیں میں نے دودھ پلایا تھا۔ سر کے یہ وہ بال نہیں ہیں جنہیں میں سنوارا کرتی تھی۔ وہ خالی ہاتھ واپس لوٹ گئی۔

یہ ہی آغاز ہے اس کہانی کے انجام کا جو 13 نومبر سن 1960ء کو وقوع پذیر ہوا۔ ایک انقلابی ظلم کے خلاف، آمریت کے خلاف، استحصال کے خلاف جدوجہد کرتا ہوا، جدوجہد کے راستے میں نقد جاں و سرمایہ حیات لٹا گیا اور جاتے جاتے راستے کی تمام رکاوٹیں روندتا ٹھوکریں لگاتا ایک شان منصوری یک آن سرمدی کے ساتھ یوں روانہ ہوا کہ تاریخ میں امر ہو گیا۔ ناصر سرخرو ہوا، ظلم و جبر رسوا ہوا، صداقت سربلند رہی، باطل سرنگوں ہوا، سب نے دیکھا اور یوں ستون دار پر ایک اور سر کے چراغ کا اضافہ ہوا۔ یہی چراغ ظلمتوں کو منور کر کے کاروانِ حیات کو منزل کا نشاں دیتے رہے ہیں۔ آج کی جمہوریت ان ہی کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔

ناصر کا قصور یہ تھا کہ وہ آمریت کو اس ملک کی ترقی و خوشحالی میں حائل ایک ایسی رکاوٹ سمجھتے تھے جسے راستے سے ہٹایا نہ گیا تو ملک کبھی ترقی پر گامزن نہیں ہو سکتا۔ اس کے موقف کی سچائی دیکھئے کہ آج آمریت کی مخالفت وہ لوگ بھی کرنے لگے ہیں جو کبھی آمریت کے دور میں برسراقتدار تھے۔ یہ کل ہی کی بات ہے کہ چار فوجی افسروں کو جمہوریت کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں 14 سال قید بامشقت کی سزا کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ ایک تاریخ ساز فیصلہ تھا جو جمہوریت کی توقیر اور عزت و تکریم میں اضافہ کرتا ہے۔

ناصر کا یہ جرم تھا کہ وہ جاگیرداری کا خاتمہ چاہتے تھے اور زمینوں پر محنت کرنے والے کاشتکاروں کو اس کا مالک بنانا چاہتے تھے۔ اس وقت وہ اور ان کی پارٹی تنہا تھی جو یہ نعرہ لگایا کرتی تھی آج ملک میں ایک بھی سیاسی جماعت ایسی نہیں ہے جو جاگیرداری کو برقرار رکھنے کی بات کرتی

ہو۔ آج جاگیردار کی پروردہ سیاسی جماعتیں بھی جاگیرداری کے خاتمے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ اب یہ پوری انسانی تہذیب کا ٹھکرایا ہوا نظام اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ ناصر ون یونٹ کو چھوٹی قومیتوں کے خلاف سازش تصور کرتے تھے۔ آج ون یونٹ قیام اور اس کا انہدام قصہ پارینہ بن گیا ہے۔ ناصر سوشلزم کو ملک کی بیمار معیشت سے نجات کا واحد حل سمجھتے تھے۔ ایوبی دور کا وزیر خارجہ اسی نعرے کو اپنا کر راتوں رات قائد عوام بن گیا۔

ناصر تبدیلی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ آج ملک کی سیاست اور معیشت کا بحران اس موڑ پر پہنچ گیا ہے کہ ملک کے طول و عرض میں تبدیلی کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ ہر فرد تبدیلی کا خواہاں ہے، نظام کی تبدیلی کے بغیر یہ بحران ختم نہیں ہو سکتا۔ لوگ حزب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں کو مسترد کر چکے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کون سا مارچ اختیار کیا جائے گا اور اس کی کیا ادا ہو گی۔ انہیں دلچسپی اس بات سے ہے کہ دو وقت کی پیٹ بھر روٹی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ انہیں دلچسپی ہے اس امر سے کہ محنت کرنے والے ہاتھ کس طرح روزگار پا سکتے ہیں۔ انہیں فکر ہے اپنے عزیزوں کی جنہیں بیماری کے علاج کے لیے دوا میسر آ جائے۔ ان کی تمنا ہے کہ ان کے بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں۔ اشیائے خورد و نوش کی گرانی ختم ہو۔ عوام کی خاموشی طوفان سے قبل سمندر کے سکوت کی آئینہ دار ہے۔ تبدیلی کی عوامی خواہش کا احترام نہ کیا گیا تو محروم و محکوم عوام کے غیض و غضب کو روکنا مشکل ہو جائے گا۔

معاشرہ ایک بار پھر دریوزہ میں مبتلا ہے اس جان کنی کے عالم کو مختصر کرنا تمام محبّ وطن، ترقی پسند انسان دوست افراد کا فرض ہے جو تاریخ کا قرض بن کر ان پر عائد ہو چکا ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ تمام ترقی پسند تنظیمیں اور تمام مزدور انجمنیں اپنی انا کے بتوں کو توڑ کر اور اپنی مصلحتوں کو چھوڑ کر ایک مقصد کے لیے ایک موقف اختیار کر کے عوام کی رہنمائی کریں تا کہ تبدیلی کے عوامی نعرے کو مثبت سمت دی جا سکے۔ سوشلسٹوں کو کمیونسٹ مزدور کسانوں کو عوامی جمہوری تحریک کے لیے قومی آزادی کے وقار کی خاطر متحد ہونا ہی پڑے گا۔ تا کہ تلنگانے کے انقلابی کی گمشدہ لاش عوامی خوشحالی کی بازیابی کا ذریعہ بن سکے۔

یہ خونِ ناصر ہے محترم ہے
یہ خون تاریخ کا علم ہے

حسن ناصر کے اقوال

اب سوچتا ہوں تو ناصر کی کہی ہوئی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں وہ عموماً کہا کرتے تھے:

☆ ...... اچھا کمیونسٹ ہونے کے لیے اچھا انسان ہونا بہت ضروری ہے۔ اچھے انسان کے لیے چاہیے کہ وہ دوسرے کی تکلیف کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرے۔

☆ ...... انقلاب برپا کرنے کے لیے ہر گھر سے ایک نوجوان انقلاب کو اپنا پیشہ بنا کر میدان میں نکل آئے۔

☆ ...... انقلابی کی ازدواجی زندگی اس کے راستے کی دیوار بن جاتی ہے، اس لئے انقلابیوں کو شادی نہیں کرنا چاہیے۔

☆ ...... کسی انقلاب کے لیے وقت کا تعین کرنا بہت ضروری ہے۔ کسی قسم کی تاخیر یا عجلت تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔

☆ ...... اپنے سے طاقتور مدِ مقابل سے گتھم گتھا ہونے کے بجائے اُس سے دور رہ کر ضربیں لگائی جائیں۔

☆ ...... تنظیم ہمیشہ جدوجہد کے راستے میں منظم ہوتی ہے اور جدوجہد ایک مسلسل عمل کا نام ہے جس میں کبھی ٹھہراؤ نہیں آنا چاہیے۔

☆ ...... کسی کام کو شروع کرنے کے لیے کارکنوں کی کثیر تعداد کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے بلکہ چند افراد جن کی فکر و عمل میں ہم آہنگی اور یکسانیت موجود ہے اس کام کو شروع کر دینا چاہیے۔ بعد کو لوگ خود اُس میں شامل ہونے لگیں گے۔ یوں ایک تاریخی ضرورت کی تکمیل ہو جائے گی۔

☆ ...... کسی سیاسی پارٹی کے قیام کے لیے لمبے چوڑے پیپر ورک منشور سے بچیں، اس طرح ابتدا ہی میں تنازعات کا شکار ہو جائیں گے۔ ایک واضح مقصد لے کر پارٹی کا اعلان کر دیں۔ اس میں عوام کی شمولیت پیپر ورک کے لیے مواد فراہم کرتی رہی گی۔

☆ ...... خفیہ تنظیم کے کارکنوں کو شراب نوشی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

☆ ...... چی گویرا بہت مثالی انقلابی ہے لیکن اُس کی ڈائری اور پرسنل سیکریٹری رکھنے کی عادت اُس کی سرگرمیوں کو افشا کر دے گی۔

☆ ...... Right man at the Right place یہ تنظیم کا بنیادی اصول ہونا چاہیے۔

☆ ...... اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے صحیح فیصلے صحیح وقت پر کرنا چاہیے۔ "Right decision at the right time"

حصہ دوم

کامریڈ دادا امیر حیدر

موہن پورہ راولپنڈی کی ایک تنگ و تاریک گلی میں واقع ایک کمرے کے کچے مکان کا بوسیدہ دروازہ نیم واہ تھا اور میں اُس کی دہلیز پر کھڑا عقیدت و احترام، محبت اور متوقع ملاقات کی مسرت انگیز ساعتوں کا تصور کرتا انبساط و جذبات کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی اُس عظیم انقلابی سے جس نے اپنی خفیہ سرگرمیوں سے جو نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط تھیں۔ جنھوں نے تمام دنیا کے آزادی کے متوالوں کو جوڑ کر رکھا ہوا تھا اور جو ایک بین الاقوامی تنظیم کے استحکام کا ذریعہ تھا۔

اس ملاقات کے لیے مجھے کئی سال انتظار کرنا پڑا تھا۔ کئی بار اس گلی کے پھیرے لگائے لیکن کبھی ملاقات اور دید کا گوہرِ مراد ہاتھ نہ لگا۔ دادا کی قید و بند ہمیشہ مانع رہی۔ اُن کا بار بار گرفتار کیا جانا ایک معمول تھا۔ اُن کی گرفتاری اور رہائی ایسی پے در پے ہوا کرتی تھی کہ اخبارات میں اس کی خبر آگے پیچھے ہو جایا کرتی تھی۔ جب وہ رہا ہو کر آ رہے ہوتے تھے تو گرفتاری کی خبر چھپ رہی ہوتی تھی۔

یہ ایک درمیانے قد کاٹھ کا 70 سالہ بوڑھا حکومتِ وقت کے اعصاب پر اس قدر گراں بار تھا کہ اُن کے ایوان اور افسران اکثر لرزہ براندام رہا کرتے تھے۔ ایوب خان کا مارشل لا اپنی پوری آب و تاب بلکہ پوری خباثت اور رعونت کے ساتھ جاری و ساری تھا۔ اخبارات میں حکومت کا یہ بیان کہ پاکستان میں کوئی کمیونسٹ موجود نہیں ہے۔ دادا امیر حیدر کے لیے ایک حیرت انگیز بات تھی وہ حکومت وقت کی ناک کے عین نیچے دارالخلافہ اسلام آباد سے پیوستہ شہر پنڈی کے ایک قدیم محلے کے اُس مکان میں جس کا دروازہ ہر وقت کُھلا رہتا تھا۔ ایک مضبوط قوت ارادی و عزم

فولادی کے ساتھ ہر وقت موجود رہتے یا پھر سارا سارا دن شہر کی مصروف و معروف گزرگاہوں پر گھوم گھوم کر اُس بیان کے دیوالیہ پن اور کھسیانے پن کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اور اپنے خیالات کی ڈور میں یادوں کے موتی پروتا بے حس و حرکت کھڑا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ''اندر چلے جائیں وہ موجود ہیں۔'' یہ آواز سی آئی ڈی کے ایک سپاہی کی تھی جو ان کی نگرانی پر مامور تھا۔

میں اُس گھر کی چوکھٹ کو اتنی آسانی سے اُنگل کر جا نہیں سکتا تھا کہ جس میں نہ صرف برصغیر بلکہ بین الاقوامی کمیونسٹ تحریک کا ایک بہادر نڈر اور طلسمی کارناموں کو انجام دینے والا بین الاقوامی پیغام رساںInternational Courier کی رہائش تھی۔ جس نے اپنی نوعمری سے اپنی سرگرمیوں کی ابتدا کی، ساری جوانی جو ایک بجلی کے کوندے کی طرح کبھی مشرق میں تو کبھی مغرب میں، آج ایک شہر میں تو کل دوسرے نگر میں، ایک طرف ڈوبا تو دوسری طرف اُبھرا کہیں سے غائب ہوا تو کہیں پر موجود پایا۔ دنیا کے گرد آزادی، حُریت، مساوات، ظلم ناانصافی استحصال، جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد کرنے والوں سے رابطے کرتا، اُن کے مسائل پر گفتگو کرتا اور دنیا بھر کے برسرِ پیکار ساتھیوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتا ''کالے پانی'' کے سیاسی قیدیوں کے فرار کے منصوبے بناتا، گاؤں اور شہروں میں ہڑتالیں کرواتا سرخ پرچم کی توقیر کو بلند کرتا گھوما کرتا تھا۔ میں دفعتاً فرط جذبات میں جھکا اور بے اختیار اس گھر کی چوکھٹ کو چوم کر اندر داخل ہوا۔

ایک کونے میں مٹی کے چولھے کے سامنے گرم کوٹ اور گرم اُونی ٹوپی اوڑھے دادا لکڑیوں کو جوڑ کر آگ تیز کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چولھے پر ایک چھوٹی دیگچی رکھی تھی۔ جس میں چائے اُبل رہی تھی۔ نیچے زمین پر ایک پیالی اور ایک گلاس رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر فوراً اُٹھے دیر تک بغل گیر ہوئے اور بڑی پھُرتی سے مجھے بیٹھنے کے لیے ایک اینٹ میرے آگے کر دی اور خود ایک اور پیالی کسی کونے سے نکال لائے۔ میں نے دیکھا ہم دو ہیں تو پھر تیسری پیالی کی ضرورت نہیں تھی۔ پیالی دھوتے ہوئے خود ہی کہنے لگے یہ پیالی اُس قسمت کے مارے جوان کی ہے جو باہر بیٹھا ہے۔ یہ بے چارہ میری نگرانی کرنے کے لیے سارا سارا دن بھوکا پیاسا دھوپ میں بیٹھا رہتا ہے، اس کے چائے پانی کا ذمہ میں نے لے رکھا ہے جب کچھ کھاتا یا چائے پیتا ہوں تو اُس کو بھی شامل کر لیتا ہوں آخر انسان کا بچہ ہے۔ ویسے میں اُس کو بازار بھیج کر سودا سلف بھی منگوا لیتا

ہوں حکومت نے میرے لئے ایک اردلی جو رکھ چھوڑا ہے، ہنسنے لگے۔

دادا نے چائے کی ایک پیالی جس کی ڈنڈی ٹوٹی ہوئی تھی اپنے سامنے کر لی اور مجھے وہ پیالی دی جو ثابت تھی اور گلاس آواز دے کر اُس جوان کو پکڑا دیا۔ ہم اپنی اپنی چائے سنبھالے اندر کمرے میں آ گئے۔

کمرہ کیا تھا ایک تاریک کھولی تھی جس میں ایک چار پائی دو ٹوٹی ہوئی لکڑی کی کرسیاں، دیوار پر کیل سے لٹکے ہوئے کپڑے، کرسیوں پر اخبار اور کتابیں، ایک کونے میں مٹی کا گھڑا جس پر المونیم کا گلاس اُلٹا کر رکھا تھا اور بس یہ تھا وہ کل اثاثہ ایک عالمی شہرت یافتہ انقلابی کا۔ جس کی بے سروسامانی اُس کی سخت کوشی و سخت جانی کی غمازی کرتی تھی۔

ساری عمر جدوجہد میں مصروف رہنے والے دادا امیر حیدر اپنی عمر کے ۷۰ سال گزار دینے کے باوجود بہت چاق و چوبند تھے، تیزی اور پھُرتی سے اُٹھتے اور بیٹھتے تھے۔ درمیانہ قد چھریرا بدن مضبوط ہاتھ پیر اور گہرا شیشمی رنگ، زندگی کی سختیوں سے نبرد آزما رہنے اور حوادث سے ہر وقت سینہ سپر رہنے کا پتا دیتے تھے۔ بات کرتے وقت پُر جوش انداز اختیار کرتے اور بڑے مزے لے کر بات کرتے تھے۔ الفاظ کو گھولتے، رولتے اور چسکیاں لیتے ہوئے بیان کرتے لہجے میں مدراس کے تاملوں کا اثر تھا۔ کئی ملکی اور غیر ملکی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ جس میں پنجابی کے علاوہ ملیالم، تلگو، ہندی، انگریزی روسی اور فرانسیسی شامل ہیں۔ دادا گفتگو کرتے وقت کسی بات کو یاد کرنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے ایسے میں اُن کا منہ کھل جاتا تھا۔ مجھے اُن کا یہ معصومانہ انداز بہت اچھا لگا اور میں بڑا محظوظ ہوتا رہا۔

دادا امیر حیدر نے اپنی سیاسی سرگرمیوں اور خفیہ رابطوں کے سلسلہ میں بے شمار ممالک کا دورہ کیا اور بار بار آتے جاتے رہے۔ وہ ایک قومی تجارتی جہاز راں کمپنی کے ایک جہاز پر خلاصی (مزدور) کی ملازمت کرتے تھے۔ یہ جہاز تجارت کی غرض سے دُنیا بھر کے شہروں اور بندرگاہوں کا طواف کرتا رہتا تھا اور دادا اپنی اس ملازمت کے ذریعہ دنیا بھر کے انقلابیوں سے رشتے جوڑنے اور اُنھیں ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کا مقدس کام نہایت دلیری جاں سوزی اور دلجوئی سے پورے انقلابی جذبے اور دیانت داری اور راز داری کے ساتھ ایسے احسن طریقے سے انجام دیتے رہے کہ دنیا بھر کی طاقتور ترین ایجنسیاں اُن کے پروردہ و گماشتہ جعلساز اہلکار و مخبر کبھی اُن کا بال بیکا

نہ کر سکے۔ وہ خفیہ دستاویزات، اخبارات اور پمفلٹ آن واحد میں ایک جگہ سے دوسری جگہ ایسی سرعت اور ہوشیاری کے ساتھ نہ صرف پہنچا دیا کرتے بلکہ خود تقسیم بھی کر دیا کرتے تھے کہ کسی کو ان پر شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ زباں دانی اور اُسی لہجہ میں گفتگو کا فن اس مہارت سے کارفرما ہوتا کہ ہر مخاطب اُنھیں اپنا ہمدرد اور دوست سمجھنے لگتا اور پھر اُن کی سرگرمیوں میں اُن کا مددگار بن جاتا اس طرح اُنھوں نے بیسیوں ہم خیال اور ہمنوا پیدا کئے۔

ایک مرتبہ ایک جہاز پر اُن کی گرفتاری کے لیے چھاپہ مارا گیا تو اُنھوں نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور ساری رات پانی کے اندر جہاز کے پیندے میں ایک کیل کا سہارا لے کر گزار دی۔ جزائر انڈیمان (کالا پانی) میں عمر قید گزارنے والے انقلابیوں کے ایک ٹولے کو فرار کروا کر دوسری مرتبہ جب پہنچے تو اُن کی آمد کا علم ہو چکا تھا وہ وہاں سے ایک ایسے راستے سے نکل کر واپس ہوئے جس کا وہاں سالہا سال سے ڈیوٹی دینے والے سپاہیوں کو بھی علم نہیں تھا۔

دادا امیر حیدر ہندوستان میں جنگِ آزادی کے رہنماؤں سے ذاتی طور پر واقف تھے اور بہتوں کے ساتھ وہ کام کر چکے تھے جن میں بھگت سنگھ، چندر شیکھر، اجے گھوش، مونی سنگھ، مخدوم محی الدین، ایس اے ڈانگے، ایم این رائے، پی سی جوشی، نمبور داری پد، جیوتی باسو اور سوبھاش چندر بوس کے نام قابل ذکر ہیں۔ بین الاقوامی طور پر وہ اسٹالین، ہو چی من، چی گویرا، فیڈل کاسترو، راول کاسترو، پیٹرس لومبا، احمد سیوکارنو اور رجنی پام دت سے رابطوں میں تھے۔ ماسکو میں اپنے قیام کے دوران وہ ہو چی من کے ساتھ مارکسزم کی کلاسوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ اسٹالین نے اُن دنوں اُنھیں اپنا ایک لانگ کوٹ تحفہ میں دیا تھا۔ جو آخری وقت تک اُن کے پاس رہا۔

دادا امیر حیدر کی ولولہ انگیز اور دلیرانہ کارگزاریوں اور معرکوں سے بھرپور زندگی کا احاطہ کرنے کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے اور اُن پر تحقیق کرنے کے لیے ایک فعال ادارہ۔ اُن کی زندگی کے واقعات کو قلم بند کرنے کے لیے جناب فیض احمد فیض اور میجر محمد اسحاق نے کام شروع کیا تھا لیکن ہر ایک کی بار بار قید و بند سے یہ کام انجام پذیر نہ ہو سکا۔ (اب یہ کام حسن رضا گردیزی نے Chains to Loose نامی کتاب جلد اول میں مرتب کر کے دی ہے۔ جسے جامعہ کراچی کے پاکستان اسٹڈی سنٹر سے شائع کیا گیا ہے۔)

دادا امیر حیدر کی پیدائش کی تاریخ کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ ایسے ماحول میں پیدا

ہوئے جہاں ہزاروں لاکھوں بچے پیدا ہو کر گمنامی میں زندگی گزار کر فوت ہو جایا کرتے تھے۔ تاہم وہ 1895ء کے لگ بھگ راولپنڈی کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جہاں غربت تھی افلاس تھا، دُکھ، درد، بیماری، بے روزگاری فاقہ کشی اور موت کے عفریت ناچتے، دندناتے پھرتے تھے۔

دادا تلاش معاش میں سرگرداں، حیراں و پریشاں گاؤں سے نکل کر گھومتے پھرتے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے بمبئی پہنچے جو ہندوستان کا ایک بڑا صنعتی اور تجارتی مرکز تھا یہاں پر اُن کی ملاقات چند انقلابی مزدوروں سے ہوئی۔ جنھوں نے دادا کے اندر چھپے ہوئے انقلابی کو اپنی فکر، سیاسی بصیرت اور تجربہ کی تیشہ گری سے تراش تراش کر باہر نکالا جو بعد میں تاریخ ساز کارناموں کی ایک طویل طلسمی داستان کے ہیرو کے طور پر اُبھرا اور جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک اپنی فہم و فراست، دانشمندی اور دور اندیشی، دلیری اور بہادری سے دُنیا بھر کے مجبور و مقہور انسانوں، مزدوروں اور کسانوں کو اپنے غصب شدہ حقوق کے حصول کی خاطر منظم کرنے اور اُس کے لیے جدوجہد کرنے کا درس دیتا رہا اور خود عملی طور پر ایک تابناک انقلابی کردار ادا کر کے سب کے لیے ایک مثال بن کر پیش ہوا۔

دادا کے نام کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ جب بمبئی پہنچے تو بے سروسامان بے یارومددگار تھے دن بھر نوکری تلاش کرتے اور رات کو فٹ پاتھ پر سو جایا کرتے تھے۔ ایک رات وہ اسی فٹ پاتھ پر دراز تھے کہ وہاں کا ایک مشہور غنڈا جسے لوگ دادا کہا کرتے تھے، ان کے پاس پہنچا اور اُن سے بدتمیزی کرنے لگا۔ دادا امیر حیدر اس مداخلت بے جا کو برداشت نہ کر سکے اور غصے کے عالم میں اس غنڈے کو ایسی پٹخنی ماری کہ وہ چاروں شانے چت جا گرا اور بھاگ کر اپنی جان چھڑائی، دیکھنے والوں نے اُنھیں اس دن سے دادا کہنا شروع کر دیا۔ اس واقعہ کی صحت اور عدم صحت تحقیق طلب ہے۔ پنجاب میں بزرگوں کو دادا کہنے کا عام رواج ہے۔ فیروزالدین منصور کو بھی دادا ہی کہا جاتا تھا۔

دادا امیر حیدر کی ایک بڑی بہن بھی تھیں۔ جنھوں نے اپنے گاؤں میں تعلیم عام کرنے کا مشن سنبھالا۔ وہاں ایک چھوٹا سا سکول قائم کیا جو اب ایک بڑی درس گاہ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

دادا امیر حیدر سن ۸۰ء کی دہائی میں اس دیارِ فانی سے تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں روانہ ہوئے۔

بے حرص و ہوا بے خوف و خطر اِس ہاتھ پہ سر اُس کف پہ جگر
یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظارۂ بامِ ناز کیا

کامریڈ مرزا ابراہیم

11 اگست 1999ء کی صبح 9 بجے جہلم کے ایک نواحی گاؤں کالا گجراں میں زندگی کی آخری سانسیں لے کر اپنے پیچھے ایک زمانے کو سوگوار چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے والے کامریڈ مرزا ابراہیم نے برصغیر میں مزدوروں اور محنت کشوں کو منظم کرنے اور ان کے شعور کو بیدار کر کے اُنھیں اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کا راستہ دکھانے والی شخصیتوں میں سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت سے تاریخ میں جو مقام حاصل کیا وہ اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ وہ خود ایک مزدور تھے اور انھوں نے اپنی پیٹھ پر بوریاں لاد کر ایک محنت کش کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا جبکہ دوسری طرف ان کی طویل العمری، ان کی قائدانہ سرگرمیوں اور جدوجہد کے عرصہ کو طویل تر بنا دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی مثال ہے جو اپنی نظیر آپ ہے۔ مرزا صاحب نے ۹۴ سال کی عمر پائی اور ۷۵ سال مزدوروں، محنت کشوں، مفلسوں اور ناداروں کے حقوق کی جدوجہد میں گزار دیئے اُن کی جدوجہد کا یہ طویل عرصہ احتجاج کرتے، جلوسوں کی قیادت کرتے، جیل کی کال کوٹھڑیوں میں اذیتیں برداشت کرتے، مشقتیں اُٹھاتے بھوک ہڑتالیں کرتے اور عقوبت خانوں میں تشدد کے ہر طریقے سہتے اس طرح بیت گیا کہ ہر گرفتاری کے بعد ان کی عظمت اور توقیر میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور ہر تشدد اُنھیں اپنے مقصد پر قائم رہنے کا حوصلہ بڑھاتا رہا جو ایک سچے انقلابی کی شان ہے۔ اُن کی اسیری اور جیلوں میں ان کے ساتھ روا رکھا جانے والا سلوک ہماری قومی سیاسی تاریخ کا ایک ایسا سیاہ باب ہے کہ اس کے مرتکب ہمیشہ تاریخ کے آگے مجرم سمجھے جائیں گے۔ دوسری طرف مرزا صاحب نے حق و باطل کے ٹکراؤ کی انسانی داستان میں جو قائدانہ کردار ادا کیا ہے وہ تا ابد زندہ و پائندہ رہے گا۔

کامریڈ مرزا ابراہیم اپنی سیاسی زندگی میں کتنی بار گرفتار ہوئے۔ خود اُنھیں بھی یاد نہیں لیکن اُن کی قید و بند کا مجموعی عرصہ ۱۶ سال بنتا ہے جب کہ لاہور کے بدنام شاہی قلعہ میں ۷ مرتبہ ایسی قید میں گزارے کہ چھ چھ ماہ تک سورج نہیں دیکھ پائے لیکن یہ بات کسی بھی محبّ وطن انسان دوست کے دل سے محو نہیں ہوسکتی کہ جب ۱۹۴۷ء میں پاکستان آزاد ہوا تو مرزا صاحب کو پبلک سیکورٹی ایکٹ کے تحت قید کر دیا گیا، گویا اُن کا آزاد رہنا عوام الناس کے تحفظ کو خطرہ پیدا کر سکتا تھا۔ اس طرح محنت کشوں اور مفلسوں کے اس محبوب رہنما کو آزاد پاکستان کے پہلے سیاسی قیدی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ اُن کا شمار تحریک آزادی کے اُن راہنماؤں میں ہوتا ہے جنھوں نے استحصال سے پاک ایک غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کو انسان کی آزادی کا بنیادی جز سمجھ رکھا تھا وہ اُجالے کے داغوں اور سحر کی شب گزر گئی کو اپنی مسلسل جدوجہد کے ذریعے آخری عمر تک دور کرنے کی انتھک کوشش میں لگے رہے اور کبھی اپنے مقصد کے حصول کی راہ میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جب تک زندہ رہے ہر باطن قوت کے آگے ایک چٹان کی طرح اٹل اور ایک پہاڑ کی طرح سر بلند رہے۔ وہ نظریاتی طور پر ایک سچے مارکسٹ تھے۔ جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں کمیونسٹ پارٹی اختیار کی، وہ مزدوروں اور محنت کشوں کو معاشرے کا ایک ایسا طاقتور ترین طبقہ خیال کرتے تھے جن کو انسانی تاریخ نے اپنے عہد کی تبدیلی کے عمل کو پائے تکمیل تک پہنچانے کا عظیم انقلابی منصب سونپ رکھا تھا اور وہ انھیں اس تبدیلی کے لیے ہراول دستہ کے طور پر منتخب کر چکی تھی۔ مرزا صاحب کی جدوجہد کا پورا فلسفہ تاریخ کے ان ہی اصولوں کی ترجمانی کرتا رہا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مرزا صاحب کی راہنمائی میں کام کرنے والے محنت کش ملک میں ہونے والے ہر ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوتے رہے ہیں۔ انگریز راج کے خاتمے سے لے کر موجودہ دور کے جاگیرداروں، سرداروں، بنکوں کے نادہندگان چور صنعت کاروں، ٹھیکیداروں IMF اور ورلڈ بنک کی خواہشات و فرمودات کو پورا کر کے مہنگائی میں مسلسل اضافہ کرنے والوں کے خلاف اُٹھنے والی ہر تحریک ان ہی کے عزم و حوصلے کی مرہون منت رہی ہے۔

کالا گجراں کے گاؤں میں پیدا ہونے والے اور انتقال کے بعد اُسی سرزمین کا پیوند ہو جانے والے مرزا ابراہیم ایک بے زمین کسان کے فرزند تھے۔ ان کے والد کا نام مرزا عبداللہ اور والدہ کا نام مائی بھاگی تھا۔ غربت و افلاس کا مارا یہ خاندان اپنے دوسرے ہم پیشہ کسانوں کی طرح

زمین پر سارا دن محنت کرتا اور یوں بمشکل کام سے دو وقت کی روٹی میسر ہوتی رفتہ رفتہ جب زمین کا یہ ٹکڑا چھوٹا پڑنے لگا اور اس سے حاصل ہونے والا رزق انھیں دو وقت کی روٹی بھی نہ دے سکا تو پھر یہ خاندان بٹ گیا، بکھر گیا۔ مرزا صاحب نوجوانی کے عالم میں زمین سے بے دخل ہو گئے یہ ہی وہ تاریخی اور انقلابی واقعہ تھا جس نے اُنھیں منہ موڑ کر شہر کی جانب تلاش معاش کے لیے روانہ ہونے پر مجبور کیا۔ جب وہ شہر کی طرف چل پڑے تو ان کے پاس محنت کرنے کے لیے دو ہاتھ تھے، کھونے کے لیے زنجیریں تھیں اور پالینے کے لیے پوری دُنیا پڑی تھی۔ محنت کی زبوں حالی اور بے توقیری کا ادراک اُنھیں اسی وقت ہوا جب وہ اپنی پیٹھ پر وزن لادے دن میں 10 گھنٹے کام کرتے تھے۔ جس کا معاوضہ صرف ایک آنہ ملا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں پنجاب میں انگریز اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اس کو وسعت دینے کے لیے دور دراز کے شہروں تک رسائی چاہتے تھے، ان کے افسروں اور فوج کے جوانوں کی نقل وحرکت کے لیے ریل کی پٹڑیاں بچھانے کا کام شروع ہوا۔ اس کے لیے مزدور درکار تھے۔ مرزا صاحب لائن مین بھرتی ہو گئے اور یہیں سے نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مزدووروں کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ نوجوان لائن مین اپنی بے باکی، سچائی، جرأت اور دلیری کے باوصف بہت جلد مزدوروں کے ہر دلعزیز قائد بن کر اُبھرے۔ ان کے پر جوش انداز تخاطب نے انھیں ایک شعلہ نوا مقرر بنا دیا۔ ۱۹۴۴ء میں وہ ریلوے مینز فیڈریشن کے نائب صدر منتخب ہوئے جو پورے ہندوستان کی ریلوے کے مزدوروں کی تنظیم تھی۔ ۱۹۴۵ء میں وہ آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی پنجاب کمیٹی کے صدر تھے، ان کے ساتھ کام کرنے والوں میں ایس اے ڈانگے، پی سی جوشی اور وی وی گری کے نام نمایاں ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا تو مرزا صاحب کو اس کا صدر چنا گیا۔ فیض احمد فیض اور فضل الٰہی قربان اس کے نائب صدر تھے جب کہ ڈاکٹر ایم اے مالک جو بعد کو وزیر محنت بنے، جنرل سیکرٹری تھے۔

1951ء میں مرزا صاحب نے پنجاب اسمبلی کا انتخاب لڑا، اس وقت وہ جیل میں قید تھے۔ عوام نے انھیں بھاری اکثریت سے ووٹ دیے لیکن حکومت کے کارندوں کی بدنیتی اور چالبازی کی وجہ سے ان کے ہزاروں ووٹ ضائع کر دیے گئے۔ اسی الیکشن کو جھرلو الیکشن قرار دیا گیا تھا۔ اس الیکشن میں مرزا صاحب کے بیلٹ بکسوں سے ووٹوں کے ساتھ کثیر تعداد میں

نوٹ بھی برآمد ہوئے۔ اس طرح عوام کا محبوب ومقبول راہنما اسمبلی کا ممبر تو نہ بن سکا لیکن انھوں نے اس پر اپنے اعتماد اور اس کے اپنی محبت اور عقیدت کا جو ولولہ انگیز اظہار کیا وہ انتخابات کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

کامریڈ مرزا ابراہیم کی زندگی جنوری ۱۹۰۵ء سے شروع ہوئی اور اس کا اختتام اگست ۱۹۹۹ء کو ہوا۔ یوں پوری ۲۰ ویں صدی پر محیط اس عظیم انسان کی حیات کا سفر راستے کی تمام تر دشواریوں کو روندتا ہوا قدم قدم پر تاریخ ساز کارنامے انجام دیتا ہوا اور ظلم واستبداد کے اندھیروں کو اپنی فکر کی سچائیوں کی روشنی سے تبدیل کرتا ہوا بظاہر ختم ہو گیا لیکن ان کے مقلدین اس کو جاری رکھیں گے اس عزم کے ساتھ کہ

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

سید سجاد ظہیر

لکھنؤ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر وزیر حسن کے چوتھے فرزند اور اپنے والدین کی چھٹی اولاد میں سے تھے۔ سر وزیر حسن اپنے وقت کے نامور وکیلوں سر تیج بہادر سپرو اور محمد علی جناح کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے اور انھیں نائٹ کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ سجاد ظہیر 1905ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی سکول میں نمایاں درجے میں کامیاب ہو کر حاصل کی۔ والدین کی خواہش تھی کہ بیٹے کو آبائی پیشہ وکالت ہی پڑھایا جائے گا۔ لندن بھیجے گئے جہاں انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ماسٹرز اور بیرسٹر کی ڈگریاں حاصل کیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں اشتراکی خیالات کو اختیار کیا اور آکسفورڈ کے طالب علموں کا ایک مارکسسٹ گروپ تشکیل دیا۔ جس پر انگلینڈ کی کمیونسٹ پارٹی نے انھیں اپنی ممبر شپ پیش کی جس کے وہ ممبر بنے۔

سجاد ظہیر بے پناہ تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے لندن میں اپنے قیام کے دوران انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی جس میں ڈاکٹر اشرف، محمود الظفر، ملک راج آنند وغیرہ نے شرکت اختیار کی۔ اس کی باقاعدہ سرگرمیاں 1936ء سے عمل میں لائی گئیں جب لکھنؤ ہندوستان میں انجمن کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت پریم چند اور حسرت موہانی نے کی اور اس میں قاضی عبدالغفار، علامہ نیاز فتح پوری اور جوش ملیح آبادی نے بھی شرکت کی۔

سیّد سجاد ظہیر 1939ء کو ہندوستان کی کمیونسٹ تحریک کے رکن بنے اور 1942ء تک 3 مرتبہ گرفتار ہوئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم کے علاوہ ہندوستان میں جاری تحریک آزادی میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کے مطالبے کی حمایت کرتے ہوئے ایک تاریخی کردار ادا کیا، وہ قوموں کی حق خود ارادیت کو پارٹی کا بنیادی اصول سمجھتے تھے۔

1948ء میں پارٹی کی کانگریس منعقدہ کلکتہ نے سجاد ظہیر کو پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا۔ سجاد ظہیر نے اسی وقت روپوشی کی حالت میں پاکستان کو ہجرت کی اور پارٹی کی تنظیم کرتے ہوئے کراچی سے لاہور پہنچے۔ ان کی سیکرٹری شپ نے پارٹی میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ کراچی میں حسن ناصر کو سیکرٹری نامزد کیا جبکہ کراچی کے سیکرٹری معروف ڈائریکٹر ایکٹرا۔ کے۔ ہنگل تھے جو بعد میں ہندوستان روانہ کر دیے گئے۔

کامریڈ سجاد ظہیر دراز قد، چوڑے بدن، سرخ وسفید رنگت جاذب نظر نقوش کے مالک تھے۔ انھوں نے روپوشی کے دوران داڑھی رکھ لی تھی اور سر پر کُلّہ باندھ کر بالکل کشمیری نظر آتے تھے۔ پارٹی کی برق رفتار تنظیم سازی جاری تھی کہ 1951ء میں حکومت نے راولپنڈی سازش کا ڈھونگ رچا کر گرفتاریاں شروع کر دیں اور ملک کے طول وعرض میں تمام سرکردہ رہنما اور کارکن گرفتار کر لیے گئے جس میں فیض احمد فیض، میجر اسحاق، ظفراللہ پوشی، محمد حسین عطا شامل تھے اس کے علاوہ فوج کے کئی افسران جس میں میجر جنرل اکبر خان اور اُن کی اہلیہ بھی شامل تھیں اس سازش میں ملزم قرار دیے گئے۔ اس کا مقدمہ عدالت میں جاری تھا کہ سجاد ظہیر نے اپنی قیام گاہ میں موجود رہ کر گرفتاری دے دی۔ اُن کے خیال میں وہ اکیلے روپوش رہ کر زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ انھوں نے کورٹ میں پیش ہو کر کارکنوں اور رہنماؤں پر عائد الزمات کی نفی کرنے اور اُن کی قانونی لڑائی میں مددگار ہونے کو زیادہ بہتر سمجھا۔ یہ مقدمہ کئی سال جاری رہا بالآخر عدالت ہی کے حکم کے ذریعہ یہ ختم کر دیا گیا اور تمام گرفتار لوگوں کو رہا کر دیا گیا۔ سجاد ظہیر بھی رہا ہو گئے۔ وہ اپنی بوڑھی اور علیل والدہ کی عیادت کے لیے ہندوستان تشریف لے گئے تو پاکستانی حکومت نے پینترا بدل کر ان کی پاکستانی شہریت منسوخ کر دی۔ پاکستان کا تائید کنندہ خود اُس کے ملک سے دربدر کر دیا گیا۔ اُدھر پنڈت جواہر لعل نہرو نے انھیں ہندوستان کی شہریت پیش کر دی۔ اس طرح سجاد ظہیر نے 1954ء میں پاکستان اور اس کے بہادر عوام اور کارکنوں کو الوداع کہہ دیا جس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہیں تھے۔ یوں سجاد ظہیر نے پاکستان میں چھ سال قیام کیا جس میں چار سال وہ جیل میں رہے۔ یہ پاکستان کے محنت کش لوگوں کی بدنصیبی تھی کہ وہ ایک نہایت مؤثر اور معتبر گوہر نایاب کی حسن کاریوں سے عرصہ دراز تک مستفید ہونے سے محروم رہ گئے۔ سجاد ظہیر کے بعد پاکستان میں اُس سطح کا کام نہ ہو سکا بعد میں حسن ناصر نے سندھ بھر میں اُسی تندہی تیزی، جوش و

جذبہ کے ساتھ اپنی اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کو روبہ عمل لاکر ایک طاقتور کمیونسٹ پارٹی کھڑی کردی اور اُس کا مشرقی پاکستان کی پارٹی کے ساتھ الحاق کردیا جس کے لیے وہ 1954ء میں اپنی ملک بدری کے عرصے میں مشرقی پاکستان کے روپوش کامریڈ مونی سنگھ اور طوحہٰ اور کلکتہ میں کامریڈ جیوتی باسُو سے ملاقاتیں کرچکے تھے۔

سجاد ظہیر ماں باپ کے ننّے میاں برصغیر کے سب سے فعال اور متحرک رہنماؤں میں سے تھے وہ بہترین شاعر، اچھے ادیب مفکر اور پُر جوش مقرر تھے۔ ان کی 3 کتابیں، روشنائی، لندن کی ایک رات اور پگھلا نیلم اردو ادب میں ایک اعلیٰ مقام رکھتی ہیں پگھلا نیلم اور لندن کی ایک رات کو کلاسیکی درجہ حاصل ہے جو اردو ادب میں پہلا تجربہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کے بے شمار تراجم اور مقالے زیرِ طبع ہیں جو سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ سجاد ظہیر نے صحافت بھی کی اور کئی رسالوں اور پارٹی کے اخباروں کے ایڈیٹر رہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ رضیہ سجاد ظہیر کی مشہور و معروف کتاب 'سماج کا ارتقا' اردو ادب میں انسانی معاشرے کی عہد بہ عہد ترقی و ترویج کی ایک مفصل داستان ہے جو اب ناپید ہے۔ اس کتاب نے ترقی پسند نوجوانوں کے ذہن کی جو آبیاری کی وہ بے مثل ہے۔

ان کی ایک بیٹی نادرہ ظہیر نے ہندوستان کے مقبول بائیں بازو کی پارٹی کے رہنما اور ایکٹر راج ببر سے شادی کی۔ پچھلے دنوں دونوں پاکستان تشریف لائے تھے جہاں جگہ جگہ ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ سید سجاد ظہیر 1973ء میں ایفرو ایشین کانفرنس میں شرکت کرنے ماسکو گئے ہوئے تھے جہاں ان پر دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔ اس طرح برصغیر کے عوام نے ایک عظیم سوچنے والا، عمل کرنے والا اور پہل کرنے والا رہنما کھودیا جس کا ثانی مدتوں پیدا نہ ہوگا۔

وہ اپنے اجداد کی میراث وزیر منزل کی کوٹھی کو چھوڑ کر اس کے سرونٹ کوارٹر میں منتقل ہو گئے تھے۔ اپنی گزر بسر کے لیے مضامین لکھے اور ترجمے کیے۔ وکالت کی موشگافیاں سیدھے سادھے مزاج کے سچے انسان کو قبول نہ تھیں چنانچہ اس سے دور ہی رہے۔ اور ساری زندگی پارٹی کے کل وقتی کارکن کی حیثیت سے گزار دی۔ موتی لال کے فرزند جواہر لال نے سجاد ظہیر جیسے گوہرِ بے مثال کو اپنے ملک میں جو عزت و تکریم اور قدر و منزلت عطا کی۔ وہ ہم سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ سجاد ظہیر اگر پاکستان میں ہوتے تو آج ہم جن مسائل سے دوچار ہیں۔ وہ سجاد ظہیر کی تحریک کے باعث بہت پہلے حل ہوچکے ہوتے۔ سب کو اُس کی محنت کے مطابق اور سب کو اُن کی ضرورت کے مطابق زندگی کی سہولتیں میسر آجاتیں یا عوام اُن کے حصول کی طرف گامزن ہوجاتے۔

کامریڈ جمال الدین بخاری

کامریڈ جمال الدین بخاری ہندوستان کی تقسیم کے وقت سندھ کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ان کا تعلق ہندوستان کے صوبے گجرات احمد کے شہر آباد سے تھا۔ کامریڈ عموماً بڑے بخاری صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے معروف ٹریڈ یونین رہنما تھے۔ یہ اور ان کی اہلیہ کامریڈ شانتا ایک ہی تحریک میں کام کرتے تھے اور وہیں سے دونوں میں شناسائی ہوئی جو پروان چڑھ کر ازدواجی رشتے میں ڈھل گئی۔ کامریڈ جمال بخاری کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے جس میں اُردو کے علاوہ سندھی، گجراتی، مراٹھی اور انگریزی شامل ہیں۔ وہ شعلہ بیان مقرر اور علم کا بحر بیکراں تھے۔ ہر موضوع پر ایسی فصیح و بلیغ گفتگو کرتے تھے کہ دل بس سُنتے رہنا چاہتا تھا۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں تحریک کی بڑی اہم شخصیات سے نیاز مندی رہی، بڑے بخاری صاحب ان میں سے ایک تھے۔ میں ان سے 3 مرتبہ لاڑکانہ میں ملا اور ایک بار حیدرآباد میں یوم مخدوم کے موقع پر، جس میں کامریڈ نے ازراہ شفقت شرکت کی اور اپنی عالمانہ خطابت سے یوم مخدوم بنادیا۔ 2 مرتبہ پارٹی کے سلسلے میں اور ایک مرتبہ ذاتی طور پر۔ میری ایک ملاقات اس وقت ہوئی جب میں نے ملازمت اختیار کر لی تھی۔ میں انگریزی سوٹ میں ملبوس تھا، مجھے دیکھ کر خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں چیخ کر کہا اُف ماڈرن ازم، آؤ بیٹھو میں تمہیں ماڈرن ازم کیا ہے بتاؤں۔ تقریباً دو گھنٹے مجھے سامنے بٹھا کر دنیا کے انقلابات، تاریخ، فلسفہ معاشیات اور انسانی معاشرت پر ایسی مفصل اور مدلل گفتگو کی کہ میں آنکھیں پھاڑے سُنتا ہی چلا گیا۔ علم کا خزانہ تھا کہ جس کا منہ کھل گیا تھا اور فکر و فلسفے کے موتی تھے کہ لڑھکتے چلے جا رہے تھے۔ کامریڈ شانتا نے اچانک ہمارے آگے ہندوستانی طرز کی کچوریاں اور بھیل پوریاں جو گرم گرم اور سوندھی

خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھیں بمعہ مختلف چٹنیوں کے رکھ دیں۔کامریڈ کی گفتگو کا تلاطم تھا تو تب جا کر مجھے اپنے موجود ہونے کا احساس ہوا۔ میں جب بھی کامریڈ کے گھر جاتا میری تواضع کامریڈ شانتا ان ہی پکوان سے کرتیں۔ اُنھیں پتہ تھا کہ میں حیدر آبادی ہوں اور ہمارے کلچر میں ایسی ہی چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ بڑے بخاری صاحب ان دنوں اپنا ایک پریس جو انقلاب پریس کے نام سے تھا، چلا رہے تھے۔ پارٹی کی سیکرٹری شپ کامریڈ سوبھو گیان چندانی کے حوالے کر دی تھی جو جیل میں بند تھے۔خود گھر پر دنیا بھر کے اخبار ایک بڑی سی میز پر پھیلائے لال، نیلے اور کالے مارکروں سے نشانات لگاتے اپنے چشمے کو ناک پر اٹکائے اور بہت قریب جھک کر انھیں پڑھنے میں مصروف ہو جاتے۔ دوپہر تک یہ ہی عمل جاری رہتا۔

کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتے اور پھر نہا کر قمیض پتلون پہنے اپنے پریس پہنچ جاتے۔ کامریڈ کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور انہیں فلسفہ، مادی جدلیات اور تاریخی جدلیات پر ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے جب سوشلزم کا نعرہ لگایا تو بخاری صاحب سے مارکسزم اور جدلیات کی مبادیات سمجھنے کے لیے اُن سے رہنمائی حاصل کی۔

ہم لوگوں نے حیدر آباد میں مخدوم ڈے کا اہتمام کیا جس کی صدارت فیض صاحب نے کی۔ میں اُن دنوں عوامی ادبی انجمن حیدر آباد کا سیکرٹری تھا۔ میں نے کامریڈ کو فون کر کے پروگرام کی تفصیل سے آگاہ کیا اور عرض کیا کہ لاہور سے فیض صاحب اور کراچی سے سبط حسن صاحب بھی تشریف لا رہے ہیں اور درخواست کی کہ آپ کی شرکت کے بغیر ہمارا پروگرام کامیاب نہیں ہوگا۔ کامریڈ نے شرکت کرنے کا وعدہ کر لیا اور ٹھیک وقت پر بسنت ہال حیدر آباد پہنچ گئے۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ ہم لوگ اسٹیشن پر لوگوں کا استقبال کر رہے تھے جبکہ کامریڈ نے ہمیں اس کا بھی موقع نہیں دیا اور خود جلسہ گاہ پہنچ گئے۔فیض صاحب کی صدارتی تقریر سے پہلے میں نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کامریڈ سے حاضرین کو مخاطب کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ مخدوم کی زندگی پر بھی روشنی ڈالیں۔ بخاری صاحب نے ایسی پُر جوش تقریر کی کہ حاضرین نے تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے پورے بسنت ہال کو سر پر اُٹھا لیا تھا۔ جب فیض صاحب آئے تو انہوں نے کہا میں بخاری صاحب کی طرح تقریر تو کر نہیں سکتا اشعار میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہوں۔ چند اشعار مخدوم پر ہوئے ہیں وہ پیش کر دیتا ہوں۔

شام کو پھر فیض صاحب ہی کی صدارت میں مشاعرہ بھی ہوا اور بخاری صاحب پورے پروگرام میں موجود رہے۔ رات کافی دیر ہوگئی تھی تو کامریڈ فیض صاحب کے ساتھ میر رسول بخش تالپور کے گھر تشریف لے گئے اور رات وہیں قیام کیا۔

کامریڈ سید جمال الدین بخاری کمیونسٹ تحریک میں ایک تاریخی کردار کے حامل تھے۔ درجنوں مزدور ہڑتالوں کی قیادت کی، متعدد بار قید ہوئے اور آخری دم تک مارکسزم کی سچائیوں سے ذہنوں کو منور کرتے رہے ظلم واستحصال کے خلاف احتجاج اور مزاحمت کرنے کو انسانی شعور کا بنیادی وصف سمجھتے تھے۔ 90 سال کی عمر میں وفات پائی۔

نقیبِ صبحِ نو

کامریڈ حیدر بخش جتوئی

کرۂ ارض پر دریائے نیل، دجلہ، فرات اور سندھو کے کناروں پر آباد ہونے والے انسانوں کی بستیوں میں وادیٔ مہران کے تمدن اور اس کی تہذیب کو جو فوقیت حاصل ہے وہ اس علاقے کے رہنے والے مرنجاں مرنج انسانوں کی صلح و آشتی، امن و سلامتی، ملنساری اور انکساری کی مرہونِ منت ہے۔

اس علاقے کی انسان دوستی اور مہمان نوازی بود و باش کا رکھ رکھاؤ۔ رویوں کا تحمل اور ٹھہراؤ وہ اوصاف حمیدہ ہیں جن کی بنا پر دنیا بھر کا کوئی بھی خطہ اس کی ہمعصری کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔

اس سرزمین نے سینکڑوں درویشوں، صوفیوں اور سنتوں کو جنم دے کر انسانوں میں محبت، خلوص، تزکیہ نفس، ایثار و قربانی، ہمدردی و انسان دوستی کے جو چراغ جلائے وہ آج تک اُسی تب و تاب کے ساتھ فروزاں ہیں۔ سندھو دریا کی تعریف میں جو اس علاقے کی خوشحالی اور فارغ البالی کا سبب بنا ہزاروں سال کی قدیم آریائی کتاب رگ وید میں یوں مرقوم ہے۔

> سندھو گھوڑوں کی دولت سے مالا مال ہے۔ رتھوں کے بیڑوں سے مالا مال ہے۔ زرق برق کپڑوں کی فراوانی سے مالا مال ہے۔ غلے، ریشم کے انبار اور شیشم کے سرسبز و شاداب درختوں کے جُھنڈوں سے آباد ہے۔ اس کے مقدس کناروں پر خوش ذائقہ شہد پیدا کرنے والے پھلوں کے تختے

مہکتے ہیں۔

(انگریزی ترجمہ پروفیسر ولسن، سندھی ترجمہ ولی رام ولبھ، اردو ترجمہ سید مظہر جمیل۔)

ایک طرف موہنجودڑو کی قدیم تہذیب کے آثار ہیں تو دوسری طرف عصر حاضر کی مردم خیز سرزمین کے طور پر لاڑکانہ یادگار ہے۔ جہاں علم وفن، فلسفہ وحکمت وسیاست وشعراور ادب کے میدان کی تاریخ ساز شخصیات نے جنم لیا۔ اسی سرزمین پر برصغیر کے نامور سپوت، عوامی راج، منصفانہ سماج، تبدیلی اور خوشحالی کے عندلیب، صبح نو کے نقیب، بے مثل خطیب، شاعر و ادیب، آزادئ فکر وعمل کے امین، عنایت اللہ صوفی کے جانشین، درویش صفت پیکرِ عزم و ہمت، مارکسی انقلابی حیدر بخش جتوئی 1901ء میں ڈوکری کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لاڑکانہ ہی میں حاصل کی۔ نہایت ذہین طالب علم تھے ہمیشہ درجہ اوّل میں کامیاب ہوتے رہے۔ کراچی کے D.J. College سے گریجویشن امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ سرکاری ملازمت کے لیے مقابلے کے امتحان میں درجہ اوّل حاصل کیا۔ جس کی وجہ سے انہیں تحصیلدار کی حیثیت میں معمور کیا گیا۔ انگریزوں کی حکومت میں یہ عہدہ ایک ہندوستانی کے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی لیکن حیدر بخش جتوئی اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ وہ طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک مختلف اندازِ فکر کے حامل بن گئے تھے اقتدار کا کروفر عوام کے سروں پر خوف و جبر طاری رکھنے کا متقاضی تھا جبکہ وہ ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہونے کو ترجیح دیتے۔ اپنی ملازمت کے پہلے ہی دن انہوں نے دیہاتوں میں کسانوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر سرکاری کام انجام دیا۔ انہیں لوگوں کا فریاد کرتے ہوئے پیروں پر گر جانا سخت ناپسند تھا۔ جاگیرداروں، زمینداروں کے حق میں سرکاری فیصلے کرنا ان کے لیے سخت اذیت کی بات تھی۔ انہوں نے گاؤں میں غربت ونکبت، بیماری ناداری، لاچاری اور مجبوری کے ایسے دلخراش مناظر دیکھے کہ احساس کی چنگاری جو زمانہ طالب علمی میں جاں گزیں ہوگئی تھی بالآخر آتش فشاں بن کر پھوٹ پڑی۔ افسر شاہی پر درویشی اور فقیری غالب آ گئی۔ ایک سچے اور کھرے انسان نے طاقت اور اقتدار کو ٹھوکر مار کر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فرنگی حکومت کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا جبکہ وہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر پہنچ گئے تھے۔ یہ سن 1940ء کی بات ہے ابھی ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا لیکن حیدر بخش جتوئی اپنے ضمیر کی آواز پر اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے آزاد تھے۔ اب اُن کے ہاتھوں میں نوکرشاہی کے اقتدار کی زنجیریں نہیں تھی

اور نہ ہی گردن میں فرنگی حکومت کے اختیارات کا طوق۔ بلکہ ان کے سینے میں انقلاب وتبدیلی کے جذبات کا الاؤ دہک رہا تھا جو جوالامکھی بن کر ظاہر ہوا۔ ایک زندہ ضمیر عوام کی محبت کا اسیر ہو کر اُن ہی کی صفوں میں جا کھڑا ہوا۔ عوام کے شعور کو بیدار کرنے، انہیں اپنے غصب شدہ حقوق کے حصول کے لیے تیار کرنے کو اپنا مقصد حیات بنا کر ساری عمر اسی جدوجہد میں بسر کرنے کا عزم لیے انقلابی حیدر بخش جتوئی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سندھ ہاری کمیٹی کی بنیاد رکھی اور سارے سندھ میں اس کی شاخیں قائم کرنے کے لیے طوفانی دورے شروع کیے۔ چشم زدن میں سارے صوبہ میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ جگہ جگہ اجتماعات ہونے لگے، جلسے اور جلوس منظم ہوئے ہر طرف سرخ پرچم بلند ہونے لگے۔ ہاری حقدار کے نعروں سے شہروں میں ٹولیاں گشت کرنے لگیں تو فرنگی حکومت لرزہ براندام ہوگئی۔ حیدر بخش جتوئی پر جلسے کرنے کی پابندی لگ گئی تو اس مرد میدان نے اس پابندی کا اس طرح جواب دیا کہ وہ روز سندھ بھر کی کسی ایک ٹرین یا بس میں سوار ہو جاتے اور تمام راستہ سفر کرنے والوں کو اپنے حقوق کے لیے متحد ہو جانے کا درس دیتے، جب ایک راستہ ختم ہو جاتا تو دوسری ٹرین میں دوسرے راستے پر چل پڑتے۔ تقریروں پر پابندی لگی تو پمفلٹوں، کتابچوں اور پوسٹرز کا طوفان در آیا۔ جب ان کے چھپوانے پر پابندی لگی تو ہاتھ سے لکھ کر کاپیاں تقسیم ہونے لگیں۔ حق و باطل کی لڑائی کا مقابلہ جاری تھا۔ وہ انقلابی ہی کیا جو تھک کر ہار مان جائے اور بیٹھ جائے جب صورتحال انتظامیہ کے ہاتھ سے نکل جانے لگی تو پھر تمام انقلابیوں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ حیدر بخش جتوئی بھی گرفتار ہوئے اور اُن پر بے شمار مقدمے قائم ہوئے، ایک مقدمہ بغاوت کا بھی قائم ہوا جو اُن کی مشہور نظم جئے سندھ کے سلسلے میں تھا۔ اس نظم میں انہوں نے سندھ کے عوام کے ساتھ ہندوستان بھر کے عوام کو آزادی کے لیے سینہ سپر ہونے کی تلقین کی تھی جس کو حکومت کے حواریوں نے اکھنڈ بھارت کا منصوبہ بنا کر پیش کیا۔ یہ مقدمہ سپریم کورٹ میں چلایا گیا اور سپریم کورٹ کے فیصلے ہی کے مطابق واپس لے لیا گیا کہ اس نظم میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں پائی گئی۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کو رہا کر کے دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور رہائی وگرفتاری کا سلسلہ ان کی تمام سیاسی زندگی میں جاری رہا ہے۔ جب کبھی وہ گرفتار ہوتے تو جیل میں قیدیوں کے ساتھ میٹنگیں ہوتیں۔ انہیں انسان کے مجبور ہو کر مجرم بن جانے کی وجوہات بیان کی جاتیں۔ قیدیوں کے لیے جیل میں بہتر حالات اچھی غذا اور علاج معالجے کی سہولتوں کے لیے

بھوک ہڑتالیں کی جاتیں تو ایک جیل سے نکال کر دوسری جیل میں منتقل کر دیا جاتا پھر اس جیل میں بھی وہی عمل دوہرایا جاتا۔ ملک کی تمام خطرناک جیلوں میں انہیں رکھا گیا لیکن ہر جیل کے قیدی ان کے لیے نئے حاضرین جلسہ کا کردار ادا کرتے اور ہر جیل ایک نئی جلسہ گاہ ثابت ہوتی۔ اس طرح تقاریر کے موضوعات میں آزادی، انقلاب اور تبدیلی کا درس شامل ہونے لگا۔ معاشرے کی غیر منصفانہ تقسیم، غربت اور امارت کا فرق بتایا جانے لگا۔ اس صورتحال پر انہیں عام قیدیوں سے دور رکھا جانے لگا اور یوں اکثر وہ قید تنہائی میں رکھے جاتے رہے۔

حیدر بخش جتوئی اپنی طالب علمی کے دنوں ہی میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بن گئے تھے۔ انہوں نے مارکسزم کا گہرا اور عمیق مطالعہ کیا تھا۔ وہ ڈارون کے فلسفہ ارتقا اور جہدِ بقا کے مداح تھے اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان کا پرچار کرتے تھے۔ پمفلٹ میں جہاں سیاسی حالات پر شدید احتجاج کرتے نظر آتے ہیں تو وہ اس وقت کی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف بھی سخت تنقید کرتے ملتے ہیں۔ یہ وصف اور ایسی بے باکی و دلیری حیدر بخش جتوئی کے علاوہ بہت کم لوگوں میں دیکھی گئی۔ حیدر بخش جتوئی ہاری کمیٹی کے ذریعہ کسانوں کو منظم کرنے کے علاوہ ملک میں سیاسی جدوجہد کے ہراول بھی رہے۔ پاکستان بننے کے بعد میاں افتخار الدین کی آزاد پاکستان پارٹی میں شامل رہے اور ایوب خان کے مارشل کے دوران نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ مل کر بہت منظم تحریک چلائی۔ ون یونٹ کے نفاذ کے خلاف بھی سرگرم رہے۔ کامریڈ حیدبخش جتوئی کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ انہوں نے پہلی مرتبہ جئے سندھ کا نعرہ بلند کیا۔ حیدر بخش جتوئی کا آزادی کا تصور، آزاد سندھ، استحصالی نظام سے آزادی، جاگیردار، سرمایہ داری نظام سے آزادی، تحریر وتقریر کی آزادی، فکر وعمل کی آزادی، سب کے لیے تعلیم کی آزادی، محنت کشوں کو انجمن سازی کی آزادی کا منشور پیش کرتا ہے۔ وہ تنگ نظر قوم پرستی کے سخت مخالف تھے۔ ایسی قوم پرستی جس میں استحصال کرنے والے اور استحصال ہونے والے ایک ہی چھتری کے سایہ میں بیٹھ جائیں۔ ایسی قوم پرستی جو مزدور طبقے کو زبان اور نسل کی بنیاد پر تقسیم کر دے۔ شہروں میں دیہاتوں سے جاگیرداروں اور زمینداروں کے ظلم وستم سے اجڑ کر لٹ پٹ کر خانما، برباد ہو کر بھوک اور افلاس سے تنگ آ کر وارد ہونے والے انسان مرد عورتیں اور بچے ایک تاریخی عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں، وہ معاش اور روزگار کی تلاش میں ایسا کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مارکس نے انقلابی فوج

کاریز رو طبقہ کہا ہے۔ ان کی دست گیری کرنا اوران کو اپنی صفوں میں شامل کرنا اپنی قوت میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔ان کے ساتھ مل کر روٹی کپڑا اور مکان کی جدوجہد دراصل انقلاب کے عمل کی جدوجہد کو وسیع کرنے کا عمل ہے۔ ایک مارکسسٹ انقلابی کا پیغام آفاقی ہوتا ہے۔ وہ پورے بنی نوع انسان کے دکھوں کو دور کرنے کا بیڑا اٹھاتا ہے۔ وہ بین الانسانیت اور بین الاقوامیت کی فکر کا محور ہوتا ہے جو ''دنیا کے مزدورو ایک ہو جاؤ'' کے لافانی نعرے اور پروگرام سے واضح ہے۔ وہ ہمیشہ طبقات کی بنیاد پر اپنی جدوجہد کو منظم کرتا ہے۔ رنگ، نسل، زبان، مذہب، عقیدہ، فرقہ، قوم، قبیلہ سب انسانوں کو تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزارتے ہیں، اس طرح انہیں گروہوں میں بانٹ کر ان کے وسیع اتحاد کو کمزور کر دیتے ہیں۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کا ہفت روزہ ''ہاری حقدار'' جو 1945ء میں حیدرآباد سے جاری ہوا، اسی فلسفہ کی ترجمانی کرتا ہوا بے حد مقبول ہوا۔ اسی اخبار کے ایک شمارے میں نواب شاہ کے ڈپٹی کلکٹر مسعود کھدر پوش کی وہ رپورٹ جو انہوں نے سندھ کے کسانوں کی حالت زار پر قائداعظم کے گوش گزارش کرنے کے لیے سن 1948ء میں لکھی تھی، چھپ کر منظر عام پر آئی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اخبار کے اس شمارے کو ضبط کر لیا گیا۔ ذیل میں اس رپورٹ کا اقتباسات پیش ہے۔

''ہاری جو کئی نسلوں سے زمین پر کاشت کرتا چلا آیا ہے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس زمین پر جس میں اس کا اور اس کے اجداد کا خون پسینہ جذب ہوا ہے کب تک کاشت کر سکے گا۔ خوف اس کی زندگی کا لازمی جز ہے۔ اپنی قید و بند کا خوف۔ زمین زندگی اور بچوں سے جبراً علیحدہ کرا دیے جانے کا خوف۔ اسے ہمیشہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں زمیندار کسی ناکردہ بات پر خفا ہو کر اسے اور اس کے خاندان کو زمین سے بے دخل نہ کر ڈالے۔ کیونکہ ایسی صورتحال میں کوئی دوسرا زمیندار اس کو پناہ دینے کا روادار نہ ہوگا اور اسے بغیر کسی مہلت کے اپنی پکی پکائی فصل، ڈھور ڈنگر اور آبائی گاؤں تک چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ ان حالات میں بے دخل ہاری کو جسمانی تشدد اور مار دھاڑ کا بھی شکار بننا پڑتا ہے اور اسے اور اس کے اہل خانہ کو چوری چکاری، ڈاکہ زنی بلکہ قتل تک کے جھوٹے مقدمات میں پھنسا دیا جاتا ہے اور کچھ نہ ہو تو دفعہ 110 کے تحت نقص امن کے جھوٹے مقدمے میں ملوث کر کے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ کسی بھی طرح کی حکم عدولی کا اندیشہ اور شائبہ تک ہاری کو زمین دار کی قہر سامانی کا شکار بنانے کے لیے بہت کافی ہوتا ہے۔ اور زمیندار کو

ہاری اور اس کے خاندان پر مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اس سے اپنے کنویں کھدوا سکتا ہے، مکان بنوا سکتا ہے یا اسی نوع کی کوئی دوسری بیگار بغیر کسی اجرت اور معاوضے کے لے سکتا ہے۔ اور ہاری اور اس کے متعلقین کی یہ مجال نہیں ہوتی کہ وہ زمیندار یا اس کے کارندوں کے احکامات کی بجا آوری میں کسی طرح بھی سستی دکھا سکے۔ اگر ہاری کی بیوی خوبصورت ہے تو ایسی صورت میں خود ہاری کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اکثر ہاری کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنی مرضی کے ساتھ زمیندار کے حوالے کر دے ورنہ خطرناک نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اگر ہاری اپنی بیوی کو زمیندار کے پاس بھیجنے پر راضی نہ ہو پائے تو پھر اسے جبراً اغوا کروایا جاتا ہے۔''

اس رپورٹ کو 56 سال گزر چکے ہیں۔ آج کے حالات سے اس کا موازنہ کیا جائے تو صورتحال جوں کی توں ہے بلکہ مزید ابتری پیدا ہوئی ہے۔ اب جاگیرداروں اور زمینداروں کی اپنی اپنی جیلیں ہیں جن میں وہ محنت کش کسان مقید ہیں جو زمینداروں کے چنگل اور ظلم سے فرار حاصل کرنے کی پاداش میں قید ہیں۔ ان میں وہ ہاری عورتیں اور معصوم بچے بھی ہیں جو اپنے اجداد کو دیے جانے والی معمولی رقموں کے عوض یرغمال رکھے گئے ہیں انہیں ان جیلوں میں لوہے کی سلاخوں اور زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا ہے۔ آج صوبہ سندھ میں جئے سندھ کا نعرہ لگانے والی کئی تنظیمیں ہیں لیکن ان حالات سے سب نے چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے۔ ملک بھر میں جاگیرداری اور زمینداری کا گلا سڑا نظام اپنے پورے اثر و رسوخ کے ساتھ موجود ہے جبکہ دنیا بھر سے اس نظام کو ٹھوکریں مار کر تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دیا گیا ہے۔

آیئے ہم اپنی ماضی کی کوتاہیوں کو ماضی ہی میں دفن کر دیں اور اب ایک بار پھر صمیمِ قلب کے ساتھ عوام سے عہد کریں کہ کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ادھورے مشن کو پورا کرنے کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے بھرپور جدوجہد کریں گے اور کسی کوتاہ اندیشی کا شکار نہیں ہوں گے۔

حالات بہت تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ راستے خود منزل کا نشاں بتا رہے ہیں۔ لوگ خود چل پڑے ہیں۔ تمام محبِ وطن، ترقی پسند انسان دوست، انصاف پسند باشعور افراد کا تاریخی فریضہ ہے کہ وہ ان لوگوں کی رہنمائی کریں اور ملک میں جمہوریت کے لیے صوبوں کی خود

مختاری کے لیے جاگیرداری اور زمینداری کے خاتمے کے لیے امریکی امپیریلزم کے خلاف جدوجہد کرنے کے لیےعوام کا ایک وسیع تر اتحاد قائم کریں۔ ملک کے تمام پیدا کردہ مسائل ان ہی سے منسلک ہیں اوران ہی کے حصول سے حل ہوں گے۔

انقلابی، مارکسی حیدر بخش جتوئی 1970ء میں ہم سے جدا ہوئے اور اپنے پیچھے قربانی، بے باکی ودلیری کی، اصولوں پر قائم رہنے کی، تابناک رہنمائی وعوام سے ایفائے عہد اور جدوجہد کی جو تابندہ مثال قائم کی وہ ہمیشہ پائندہ وزندہ رہے گی۔

صبح نو کے سورج کو طلوع ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

کامریڈ امام علی نازش

امام علی نام، نازش تخلص، خان خاندانی خطاب، نقوی سلسلہ، گھر میں سب "چھمن" پکارتے تھے 1930ء میں پیدا ہوئے امروہے کے رہنے والے تھے۔ تقسیم کے بعد پاکستان آنے والے ترقی پسندوں میں شامل تھے۔ شاعری کرتے تھے اس لیے ابتدا میں ادبی محاذ ہی پر سرگرم رہے۔ ادبی محاذ پر جب تک کام کرتے رہے اپنا نام نازش امروہی لکھا کرتے تھے۔ خوشحال گھرانے سے تعلق تھا۔ ہندوستان میں اپنا ایک بیٹا اور بیوی چھوڑ کر آئے تھے جس سے اُن کے مستقبل کے ارادوں کا پتہ چلتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے آفس سیکرٹری تھے۔ 1954ء میں جب اس پر پابندی لگی تھی تو یہ منصب چھوڑنا پڑا۔ 58ء کے مارشل لاء سے قبل سندھ بھر سے جن چار کمیونسٹ رہنماؤں نے روپوشی اختیار کی ان میں کامریڈ نازش بھی شامل تھے۔

درمیانے قد کے دُبلے پتلے اور صاف رنگت کے آدمی تھے انہیں ابتدا ہی سے تنفس کے مرض کا عارضہ تھا جو بڑھتا بڑھتا شدت اختیار کرنے لگا تھا۔ انہیں پارٹی کی قیادت ایسے پُرآشوب دور میں سنبھالنی پڑی جب کہ کامریڈ شرف علی پارٹی چھوڑ چکے تھے۔ کامریڈ ناصر شہید ہو چکے تھے اور کامریڈ عزیز سلام بخاری نے پارٹی کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا ایک علیحدہ گروپ بنا کر پارٹی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ کامریڈ نازش بیک وقت کئی محاذوں پر برسرِ پیکار تھے۔ روپوشی کی سخت اور المناک صعوبتیں، پارٹی میں نظریاتی کشمکش، تنظیم کی ٹوٹ پھوٹ اور اپنی بیماری کی شدت۔ ایک کمزور اور ناتواں انسان جو دائم المریض بھی تھا، اپنی ہمت حوصلے اور عزم کی طاقت کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف پارٹی میں پارٹی کی بنیادی نظریاتی اساس سے منحرف لوگ آہستہ آہستہ پارٹی کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے لگ گئے تھے۔

انہوں نے اپنی انتہا پسندی، مہم جوئی اور ناقص منصوبہ بندی سے ایک خفیہ تنظیم کو اپنی تجربہ گاہ اور اس کی سیاست کو بازیچہ اطفال بنالیا تھا۔ کارکن آئے دن پکڑے جاتے اور پولیس کی بہیمانہ تشدد کا شکار ہو جاتے۔ اس عرصہ میں جتنے بھی خفیہ منصوبے اور کارروائیاں انجام دی گئیں وہ سب کی سب طشت از بام ہوتی رہیں۔ خود کامریڈ نذیر عباسی کی شہادت ایک ناقص حکمت عملی کی ایک طویل داستان ہے۔ جو دلخراش و دلگداز ہے۔

بعد کے حالات میں ان تمام کوتاہیوں کا جواب مل جاتا ہے۔ جب پارٹی کے اُن مقتدر عناصر نے مارکسزم اور سوشلزم سے تائب ہو کر پارٹی سے فرار اختیار کیا اور مارکسزم و سوشلزم کو ناقابل عمل قرار دیا۔ پارٹی بار بار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی گئی۔ ایک موقع پر اعزاز نذیر نے پارٹی سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی الگ پارٹی بنالی جس کا جنرل سیکرٹری حسن رفیق کو بناڈالا۔

کامریڈ نازش کے پاس ایک یہ ہی راستہ تھا کہ وہ پارٹی کے بچے کھچے ملبے کو جوڑ کر رکھیں، انہوں نے مزدور کسان پارٹی سے اتحاد کر کے ایک نئی پارٹی کمیونسٹ مزدور کسان پارٹی کی بنیاد رکھی۔ اُس کے وہ پہلے چیئر مین منتخب ہوئے۔ اسی عرصہ میں کامریڈ نازش کی بیماری نے مزید شدت اختیار کر لی۔ اب وہ باضابطہ طور پر ٹی بی سینیٹوریم میں داخل ہو گئے۔ اس طرح پارٹی کے نظریات کی شکست وریخت کا، تنظیم کی کشاکش کا اور جان لیوا بیماری سے زندگی اور موت کی کشمکش کا ایک طویل عرصہ مقابلہ کرتے ہوئے اسی سینیٹوریم میں انتقال کر گئے۔ وہ اپنے علاج کی غرض سے ماسکو بھی گئے۔ تھے واپسی میں افغانستان بھی ٹھہرے، اُن دنوں شاید حفیظ اللہ امین برسرِ اقتدار تھے۔

کامریڈ نازش کی شاعری بکھرے اوراق کی شکل میں ڈاکٹر بلقیس اور محبوب علی کے پاس بطور امانت محفوظ ہے۔ وہ 25 سال کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے جنرل سیکرٹری رہے اور 30 سال کے لگ بھگ روپوشی کی اذیت ناک زندگی بسر کی۔

ہم نے تو ایک عمر جان کنی میں گزار دی
عیسیٰ تو صرف دو ہی دن رہے تھے صلیب پر

سندھ کا انقلابی کامریڈ نذیر عباسی

سندھ کی سرزمین پر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کئی نامور شخصیات نے آنکھ کھولی اور اپنے تصورات وخیالات اور فکروذکر کے کمالات سے بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے بے شمار کام انجام دیے جس میں معاشرے اور معاشرتی مسائل پر زیادہ توجہ دی گئی، یہ کام ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، صوفیوں اور قلندروں کے علاوہ سیاسی کارکنوں نے بھی مثالی طور پر انجام دیا۔ صوفی عنایت اللہ شہید نے جس نظریے فکر کی ابتدا کی اُس کو جاری وساری رکھنے اور اُس میں مزید بہتری اور زندگی سے ہم آہنگی پیدا کرنے اور اُس کو جدید سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے جن اکابرین اور قائدین نے اپنی تمام عمران مقاصد کے حصول کے لیے وقف کردی، اُن میں کامریڈ نذیر عباسی کو ایک منفرد مقام یوں حاصل ہے کہ وہ دورِ حاضر کے افکار میں سب سے زیادہ موثر، سائنسی اور حکمی نکتہ نگاہ اور فلسفہ کے نا صرف پیروکار تھے بلکہ دنیا بھر میں قبولیت عام حاصل کرنے والی اُس تحریک کے صوبہ سندھ کے قائدین میں شمار ہوتے تھے۔ وہ انقلابی اور اشتراکی تحریک کے جانثاروں میں سے تھے جنھوں نے عملی طور پر اپنی نقدِ حیات کو اس تحریک پر نچھاور کردیا۔

وہ ایک ایسے ماحول میں تپ کر کندن بنے جہاں بھوک، تنگدستی، بیماری ناداری، محرومی اور جہالت تھی۔ بوڑھے ماں باپ، چھوٹے بہن بھائی، تن پر مناسب لباس اور بہتر زندگی کے احساس سے عاری تھے۔ عرضی نویس باپ کی قلیل آمدنی نے سفید پوشی کی چادر سے سب کچھ ڈھانک کر رکھا ہوا تھا کہ معاشرے میں اس گھر کی ضرورتوں کے لیے تنگدستی اور تنگ آمدنی باعث ندامت و پشیمانی نہ بن جائے۔ گھر کا بیٹا اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالتا ہر طرف اندھیرا، خوف، یاس، حبس، گھٹن، تازہ ہوا نہ روشنی کی کرن، مایوسی، افسردگی، ڈپریشن چھایا ہوتا۔

سڑکوں پر بیٹھ کر چھولے اور پکوڑے بیچے۔ تعلیم حاصل کرنے کی لگن اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت مگن دن رات ایک کر کے میٹرک پاس کر لی تو گھر والوں نے پہلی بار خوشی دیکھی، سب کے چہروں پر مسکراہٹ اور خوشی نمودار ہوئی۔ ماں باپ کی آنکھوں میں روشنی اور زندگی نظر آئی اور جب مقامی میونسپلٹی میں ناکہ منشی کی نوکری لگی تو روتے بسورتے بہن بھائیوں نے اپنے آنسو پونچھے کہ شاید ہمارے شب و روز سے دلدر دور ہو جائے۔

نذیر کا ذوق تعلیم بڑھا، اب دن کو نوکری کی مشقت اور رات کو تعلیم کی محنت، ساتھ ہی ساتھ محرومیوں سے نفرت بھی بڑھی۔ تعلیم نے شعور کی روشنی کو بیدار کیا، غربت کی وجہ منکشف ہونے لگی۔ دولت، عزت اور مراعات کی اجارہ داری کا بھانڈا پھوٹا، امیری اور غریبی کو مقدر کا کھیل بتانے والوں کا دروغ ٹوٹا۔ جیسے جیسے علم کی دوشیزہ کا بانکپن نکھرتا گیا ویسے ویسے معاشرے سے بغاوت کی چنگاری بھوکے بدن اور ننگے تن میں حرارت پیدا کرنے لگی۔ دماغ سے فرسودہ تصورات اور خیالات کے تانے بانے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ معاشرے کی بوسیدہ حویلی کی دراڑیں نظر آنے لگیں۔ سماج کی بنیادیں لرزتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔

چھولے بیچنے والے نے ایک نئی دنیا کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ دکھوں، آہوں اور محرومیوں سے پاک دنیا کا خواب دبی ہوئی چنگاری آہستہ آہستہ بھڑک رہی تھی۔ ظلم ہی ظلم کے خلاف بولنے کی زبان دیتا ہے اور ذہنوں میں سوال پیدا کرتا ہے۔ ناانصافی اور استحصال سینوں کو ڈھال بنا دیتا ہے۔ ستم ہی ستم کے ہاتھ توڑ دینے کی طاقت اور اس کا استعمال سکھاتا ہے۔

ایک جیسے حالات سے برسرِ پیکار لوگوں کا اتحاد معاشرے میں جاری استبداد کو روک سکتا ہے۔ اب سروں کو جوڑنے، ذہنوں کو جلا دینے اور قدم سے قدم ملا کر بڑھنے کا عمل شروع ہوا۔ ناکہ منشیوں کی یونین قائم ہوئی اور کالج میں مارواڑہ سکول یونین کا قیام عمل میں آیا جو جدوجہد کے راستے متعین کرنے لگے۔ پہلا احتجاج کالج پرنسپل پروفیسر افغان کی معطلی پر کیا۔ جنرل یحییٰ خان کے دور میں الیکشنوں کے لیے سندھی زبان میں ووٹر لسٹ کی چھپائی کے لیے پہلی بھوک ہڑتال کی اور 1969ء میں پہلی گرفتاری عمل میں آئی۔

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

قید و بند اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ دراز ہوا، اُدھر نذیر عباسی یونیورسٹی کے طالب علم بن گئے تھے۔ تعلیم کے آسمان پر اس برق رفتاری سے اُڑان افرادِ خاندان میں خوشی کی لہر تو دوڑا دی مگر ساتھیوں کے لیے ایک اچھے راہنما اور سچے اگوان نے جنم لیا جو دکھوں سے نڈھال، مفلوک الحال لوگوں کی رہبری اور اگوانی کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا جذبہ انسانی رکھتا تھا۔

کراچی جیل منتقلی پر اُن کی ملاقات اُن انقلابیوں سے ہوئی جو ملک بھر میں تبدیلی اور سماجی انقلاب کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے گرفتار بیٹھے تھے۔ اب قطرہ مٹی کا رزق بننے کے بجائے خود دریا میں ضم ہونے کے عمل سے گزر رہا تھا۔ ان انقلابیوں میں ڈاکٹر اعزاز نذیر اور ڈاکٹر رشید حسن خان شامل تھے۔ یہاں نذیر عباسی کی سوچ کو مارکسزم کے نظریہ کی روشنی سے ضیاء پاش ہونے کا موقع ملا۔ ذہن کے دریچے وا ہونے لگے۔ اب آنسوؤں، سسکیوں اور آہوں کی بے عمل اور مایوسانہ زندگی کو ٹھوکر مار کر سماج کی تبدیلی، آزادی، بے باکی اور بیداری کی ولولہ انگیز کارروائیوں کو اختیار کرنے کا درس ملا۔ قوت، طاقت اور ہمت کو مجتمع کر کے جبر اور قہر کے ہاتھوں کو توڑ دینے کا سبق ملا۔ ان انقلابیوں کی تعلیم سے نذیر عباسی کو یہ جاننے کا موقع ملا کہ دنیا میں دو ہی طبقے ہوتے ہیں ایک ظالم کا اور دوسرا مظلوم کا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے چلے آئے ہیں۔ ایک کی موت دوسرے کی حیات کو فروغ دیتی ہے۔ ظالم کی حیات مظلوم کے خون سے نمو پاتی ہے۔ ریاست کے تمام ادارے ظالم ہی کے طرف دار اور تنخواہ دار ہوتے ہیں۔ وہی طبقہ اس جنگ و جدل میں کامیاب اور کامران ہوتا ہے جو زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کے تاریخی عمل سے گزرتا ہے۔ سماج کا ارتقا ہمیشہ آگے کی طرف اور بہتری کی طرف ہوتا ہے۔ ہر مظلوم طبقہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ایک آخری لڑائی منظم کرتا ہے جس کو انقلاب کہتے ہیں لیکن اس کے لیے طویل اور صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماج کا باشعور طبقہ معاشرے کی اس تاریخی کشمکش میں اپنے لیے مظلوم طبقہ کا ساتھ دینے کا راستہ نہ صرف اختیار کرتا ہے بلکہ اس لڑائی کو تیز تر کرنے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ دُنیا بھر میں یہ لڑائی مختلف ملکوں میں مختلف مراحل سے گزر رہی ہے۔ کارل مارکس دُنیا کا وہ واحد فلسفی ہے جس نے عوامل قدرت کی صرف تشریح ہی نہیں کی بلکہ اس میں تبدیلی کے قوانین دریافت کیے اور یہ بھی بتایا کہ تبدیلی کے عمل کو تماشائی بن کر دیکھتے رہنا ہی نہیں بلکہ اس تبدیلی میں شامل ہو کر اس میں قائدانہ کردار ادا کرنا چاہیے۔

ان اسباق کی صداقتوں کے سحر نے نذیر عباسی کی سوچ میں ایک انقلابی لہر پیدا کردی اور وہ اس نظریے کی سچائی کے امین بن گئے قطرہ دریا میں شامل تو ہو ہی گیا تھا اب اس کی لہروں میں تموج پیدا ہونے لگا جس نے بعد میں طوفانوں کو جنم دیا۔

وہ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو گئے اور کمیونسٹ پارٹی کی رکنیت بھی حاصل کرلی۔ اب جدوجہد میں شدت اور موقف میں صلابت پیدا ہوئی جس کی ابتدا یوں ہوئی کہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو سزا کے طور پر بند وارڈ کے خلاف بھوک ہڑتال کردی اور اس ہڑتال کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے پانی پینا تک چھوڑ دیا جس کی وجہ سے انتظامیہ نے خوفزدہ اور مجبور ہوکر بند وارڈ کا فیصلہ واپس لے لیا۔ سندھ کی سرزمین پر ایک اور انقلابی، اشتراکی اور مارکسی نذیر عباسی پیدا ہو چکا تھا۔ ایک چھوٹے سے خاندان کا چشم و چراغ پوری قوم کے لیے مینارِ نور بننے کے عمل میں تھا، اس کے دل میں چھوٹے سے گھر کی محرومیوں کے ساتھ پوری قوم کا درد سما گیا۔

کامریڈ نذیر عباسی نے 1972ء میں کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی 1974ء میں سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ 1975ء میں اسی تنظیم کی صدارت حاصل کی جو آخری دم تک جاری رہی جبکہ تاج مری اس تنظیم کے جنرل سیکرٹری تھے۔ دوسری طرف کمیونسٹ پارٹی میں بھی اعتبار اور احترام کے درجات عبور کرتے رہے۔ مرکزی کمیٹی کے رکن بنے اور صوبہ سندھ کے جنرل سیکرٹری ہوئے۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں 1978ء میں اُن کی گرفتاری ایک خفیہ رسالے "ہلچل" کی اشاعت اور اُس کی خفیہ تقسیم کے سلسلے میں عمل میں آئی۔ اس رسالے میں مارشل لاء کی مخالفت اور جمہوریت کے حق میں مضامین شامل تھے۔ جب انھیں گرفتار کیا گیا تو کوئٹہ لے جایا گیا اور فوجی قلی کیمپ میں شدید جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئیں۔ کافی عرصہ قید میں رکھنے کے بعد رہائی کے وقت حکام نے انھیں یہ انتباہ بھی دیا تھا کہ وہ دوسری مرتبہ گرفتار ہوئے تو زندہ بچ کر نہیں جاسکیں گے۔

اس عرصہ میں اُن کی اہلیہ محترمہ حمیدہ گھانگرو جو خود بھی سیاسی ماحول میں پروان چڑھی تھیں پٹ فیڈر کے کسانوں کی حمایت میں نصیر آباد، ڈیرہ مراد جمالی میں بھوک ہڑتال کردی جس میں محترمہ آصفہ رضوی بھی شریک تھیں۔ ان خواتین کے علاوہ اس تحریک میں گرفتار ہونے والوں میں کامریڈ رمضان میمن، کامریڈ عمر دین اور کامریڈ غلام اکبر شامل تھے۔ اس تحریک کی تفصیل کے

لیے ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔ کامریڈ نذیر عباسی کی شادی محترمہ حمیدہ گھانگرو سے 1978ء میں ہوئی۔

کامریڈ نذیر عباسی نے ایک طویل عرصہ روپوشی کی زندگی بھی بسر کی اور اس دوران ان کا خاندان معاشی ابتری کا شکار رہا۔ کامریڈ نذیر عباسی کی آخری گرفتاری روپوشی کے عالم میں 30 جولائی 1980ء میں ہوئی۔ ان کی گرفتاری ہمیشہ پولیس کے لیے دردِ سر اور چیلنج ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک چھلاوے کی طرح اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے کی تصویر تھے۔ اب اُن کے کام میں شدت، صلابت کے ساتھ مہارت بھی پیدا ہوگئی تھی۔

اگرچہ بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ گیا ہے پھر بھی یہ ایک تاریخی فریضہ تمام ترقی پسند ساتھیوں کو ادا کرنا اور تاریخ کا قرض چکانا ضروری ہے کہ تمام واقعات اور ساتھیوں کے بیانات کا جائزہ لے کر ایک وائٹ پیپر (قرطاس ابیض) مرتب کریں تاکہ حقائق پر پڑا ہوا پردہ اٹھایا جاسکے۔ اس سلسلے میں کامریڈ نذیر عباسی کی دُختر زرقا عباسی کی اُس کتاب سے بھی کافی مدد مل سکتی ہے جو انہوں نے تقریباً 75 افراد کے بیانات سن کر اور مضامین پڑھ کر 2002ء میں شائع کیے۔

وہ 30 جولائی 1980ء کا ایک منحوس دن تھا جب کامریڈ نذیر عباسی اپنی روپوشی کے عالم میں چہرے پر داڑھی رکھے سر پر سفید ٹوپی اوڑھے بچتے بچاتے، چھپتے چھپاتے راستہ چلتے، راستہ بدلتے اُس جگہ پہنچے جہاں ایک میٹنگ میں انھیں شرکت کرنی تھی۔ یہ بدنام لنڈی کوتل چورنگی کے پاس کالے بازار کا ایک مکان تھا جو کمال وارثی کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ یہ بات توجہ طلب ہے، مکان اکثر بند رہا کرتا تھا صرف میٹنگوں کے لیے استعمال ہوا کرتا تھا۔ اس لیے علاقے میں اس مکان کی پہچان ایک پُراسرار گھر کی سی ہوگئی تھی۔ چونکہ یہ سارا علاقہ غیر قانونی کاروبار کے لیے مشہور تھا اس لیے اس گھر کی پُراسراریت میں مزید اضافہ ہوا۔ ایجنسیوں کے لیے یہ گھر ایک معمہ بنا ہوا تھا جو اُس کی اصلیت جاننے کے لیے سرگرم ہوگئے تھے۔ ایسی صورت میں ساتھیوں کو اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے تھا لیکن اس میں میٹنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ سُنا جاتا رہا کہ ایک مرتبہ اس گھر میں ایجنسی کے لوگ رات کے وقت دیوار پھلانگ کر داخل ہو چکے تھے اور تمام ضروری شواہد اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ پہلی مرتبہ انہیں شبہ ہوا تھا کہ یہاں اسمگلنگ یا منشیات کی فروخت کا کام ہوتا ہے۔ دیوار پھلانگ کر داخل ہونے کے بعد یہ بات آشکار ہوئی کہ یہ کوئی خفیہ تنظیم کا دفتر ہے اور

''ہلچل'' نامی رسالہ جس کے سلسلے میں کامریڈ نذیر عباسی قبل ازیں گرفتار ہوکر فوجی قلی کیمپ میں پہنچادیئے گئے تھے، اسی جگہ سے چھپتا ہے۔ جب ساتھیوں کو اس چھاپے کا اندازہ ہوگیا تو اُس دن کے بعد سے اس مکان کے دروازے پر برائے فروخت کا اشتہار لگا دیا گیا تھا۔ اس اشتہار کے لگنے سے پولیس کی کارروائی میں تیزی آئی، جزوقتی نگرانی کل وقتی نگرانی میں تبدیل ہوئی اور وہ اس گھر کو چوبیس گھنٹے اپنی نظر میں رکھے ہوئے تھے۔ تاہم یہ ہنوز خفیہ میٹنگوں میں استعمال ہوتا رہا۔

جب نذیر عباسی میٹنگ کی غرض سے اس جگہ پہنچے تو انھیں اس کے قرب و جوار میں چند مشکوک افراد کی چہل پہل نظر آئی۔ اُنہوں نے معاملے کی نزاکت کو بھانپ لیا اور گھر کے روزنوں سے اندر کی طرف جھانک کر دیکھا تو وہاں کمال وارثی اور پروفیسر جمال نقوی کے علاوہ سادے کپڑوں میں ملبوس کچھ اور لوگ نظر آئے۔ وہ فوراً واپس ہوئے اور دوڑتے ہوئے ایک بس روٹ نمبر 2K میں چڑھ گئے۔ چند سپاہی لپک کر ان کے پیچھے دوڑے اور انہیں بس کی سیٹ پر بیٹھا ہوا پایا۔ نام پوچھا تو انہوں نے مشتاق بتایا اور اُس نام کا شناختی کارڈ بھی جیب سے نکال کر دکھایا لیکن ایجنسی والے اس بات سے مطمئن نہیں ہوئے اور انھیں پکڑ کر اُس مکان میں موجود لوگوں سے ان کی پہچان کروائی۔

جواں مردی اُسی رِفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جست کی تھی

کامریڈ نذیر عباسی گرفتار کر لیے گئے تھے جو صوبہ سندھ کی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر تھے اور سندھ یونیورسٹی میں سیاسیات کے طالب علم تھے۔

کامریڈ نذیر عباسی اپنے قاتل کو ڈھونڈتے آواز دیتے ہوئے اپنی صلیب کو اپنے کاندھوں پر اُٹھائے مقتل میں اُسی جگہ پہنچے جہاں سے عظمت انسان کی رفعت اور بلندی کو دیکھنے کے لیے اوج ثریا سر اٹھا کر اور پلکیں جھپکا کر دیکھتی ہے۔ وہ اُسی مقام پر پہنچے جہاں پر ظالم اور مظلوم کے درمیان حق اور باطل کے بیچ دست بہ دست مقابلہ ہونے کو تھا۔ وہ اُسی مقام پر پہنچے جس کے لیے انھوں نے کہا تھا، میں پھر آؤں گا ظلمت میں روشنی کی طرح، نسیم سحری کی طرح باد بہاری کی طرح۔

9 دن اور 9 رات اذیتوں کا طوفان ایک کمزور بدن انسان طاقتور عزم و ایقان کا

نوجوان ظالم بھیڑیوں کے درمیان ظلم کے خلاف لڑتا، باطل کے خلاف جنگ کرتا، محنت کشوں اور کسانوں کے حقوق کی عظمت کو سینے سے لگائے تبدیلی اور انقلاب کے نعرے بلند کرتا زمین پر گرا تو پھر اُٹھ نہ سکا۔ وہ بلندتر ہو چکا تھا اُس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں پر عظمت انسان کو فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ وہ زبان خاموش ہوگئی تھی جو سندھ بھر کے مظلوموں کا مقدمہ لڑا کرتی تھی۔ اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔

دوستو! قافلہ درد کا اب کیا ہو گا
اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشن غم

ایجنسیوں کے حکام نے اپنی انتباہ کے عین مطابق وہی کیا جو اُن کو کرنا تھا۔
کامریڈ نذیر عباسی نے بھی وہی کیا جو ایک انقلابی کا کام تھا۔ ایک انقلابی ہمیشہ موت سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے لیکن اپنے آدرش کی خاطر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ موت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب ہوتا ہے۔ وہ انقلابی ہی ہے جس کو دیکھ کر موت کے بھی پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔

معرکہ حق و باطل کا یہ واقعہ تاریخ کا ایسا دل گداز لیکن درخشاں باب ہے جو ابد سے آباد ہے جسے قوم ہمیشہ یاد رکھے گی۔

کامریڈ نذیر عباسی کی نعش کو اُن کے ایک دور کے رشتے دار کو دکھایا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ اسے وصول کر لے لیکن وہ شخص نعش کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا اور اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اُس نے پہچاننے سے انکار کر دیا تو نعش کو "ایدھی" کے سرد خانے میں لاوارث کہہ کر رکھوا دیا گیا۔ ایدھی والوں نے نعش کی خستگی کا اندازہ لگا کر اُس کو رات کے پچھلے پہر سخی حسن کے قبرستان میں دفنا دیا۔ قبرستان کے چوکیدار نے کامریڈ نذیر عباسی کے بردار نسبتی فیض گھانگرو کو دوسرے دن قبر کی نشاندہی کی۔

9 اگست 1980ء کی صبح ایک نیا سورج نئی روشنی لے کر طلوع ہوا جو اندھیروں کو چیرتا ہوا نوع انسانی کی حیات کو فروغ دیتا اپنی تابناک کرنوں سے منور کرتا رہے گا۔

جو چل سکو تو چلو راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل فرازِ دار و رسن سے پہلے

کامریڈ شرف علی

ہندوستان سے تقسیم کے بعد کراچی کی طرف رخ کرنے اور یہاں کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں شامل ہو کر نیا تاریخی کردار ادا کرنے والوں میں کامریڈ شرف علی بہت نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ بہت اچھے منتظم، پُر جوش اور مؤثر گفتگو کرنے والے۔ بہت جلد کامریڈ سوبھو کے دست راست بن گئے اور گودی کے مزدوروں میں بہت مقبول ہو گئے۔

1948ء میں پہلی مرتبہ ڈیفنس ایکٹ آف پاکستان کے تحت گرفتار ہوئے اور 4 سال قید رہ کر رہا ہوئے۔ ان پر غداری کا مقدمہ چلا، گرفتار ہونے والوں میں کامریڈ سوبھو اور ڈاکٹر کنور محمد اشرف کے ساتھ حسن ناصر، اے کے ہنگل اور عزیز سلام بخاری بھی شامل تھے۔

1954ء میں جب کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد ہوئی تو ملک بھر سے درجنوں کارکن گرفتار ہوئے، ساتھ ہی انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی پابندی لگی۔ کامریڈ شرف ایک مزدور بستی میں روپوش ہو گئے، انہوں نے داڑھی رکھ لی اور مولویوں کا حلیہ اختیار کر لیا، وہ مولانا کے نام سے جانے جاتے تھے۔ روپوش رہ کر پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے کو سنبھالے رکھا۔ 1956ء میں سیاست میں عوامی اُبھار اور پھر NAP کے قیام کے بعد اپنی روپوشی ختم کر کے منظر عام پر آ گئے۔ 1957ء میں گولی مار کے علاقے سے الیکشن لڑنے والے محمود الحق عثمانی کے چھوٹے بھائی سراج الحق عثمانی کی الیکشن مہم کے انچارج بن گئے۔ الیکشن کا دفتر مرزا کاظم کے سکول میں قائم ہوا اور اسی احاطے کے باہر NAP کا دفتر بھی قائم ہوا۔ میں اس دفتر میں آفس سیکرٹری تھا۔ انھوں نے الیکشن کے دقت طلب اور دشوار امور کو بڑے احسن طریقے سے انجام دیا اور بیسیوں کارکنوں کو مختلف کاموں سے منسلک کر کے اور اُس سے مؤثر نتائج حاصل کر کے اپنی انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ہم

لوگ ووٹرلسٹوں کی تیاری کرنے اور اُس کی بے شمار کاپیاں بنانے کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ ووٹر لسٹ بنانا بڑا توجہ طلب کام تھا ووٹر کا نام، ولدیت، عمر اور پتہ صحیح صحیح تحریر کرنا ضروری تھا۔ ہم لوگ صبح 10 بجے سے شام کو 8 بجے تک اسی کام میں مصروف رہتے۔ ہمارے لیے چاء، سگریٹ اور دوپہر کو دال روٹی کا بندوبست کرنا بھی اِن ہی کا کام تھا۔ سگریٹ اس زمانے میں ڈائمنڈ کی بہت مقبول تھی اور ترقی پسندوں کا نشان بن گئی تھی۔ یہ سگریٹ سب کو برابر برابر گن گن کر دیا کرتے۔ میں چین سموکر تھا مجھے سگریٹیں کم پڑتی تھیں تو بس اُن کے پاس دستِ سوال دراز کرتے اور اشاروں سے سگریٹ کے ختم ہو جانے کا مدعا لے کر پہنچ جاتا وہ ازراہ ہمدردی مجھے اپنے کوٹے کا سگریٹ دے کر کم پینے کی تلقین کرتے، میں اثبات میں سر ہلا دیتا اور دوسرے دن پھر پہنچ جاتا۔ کہتے تھے ٹی بی ہو کر مرے گا۔ ہم دونوں اپنی اپنی عادتوں سے مجبور تھے۔

الیکشن میں دوسرے امیدواروں نے لاکھوں خرچ کیے۔ ہر روز بریانی کی دیگیں تقسیم ہوتیں۔ بڑھیا قسم کے سگریٹ تقسیم کیے جاتے۔ لیکن کامریڈ شرف علی کو ایک قلیل رقم میں سب کچھ کرنا تھا۔ جسے انہوں نے پوری دیانت داری اور احساس ذمہ داری سے انجام دیا۔

الیکشن کا نتیجہ اگرچہ ہمارے حق میں نہیں نکلا لیکن اس دوران کارکنوں کی بہترین سیاسی تربیت ہوئی۔ گولیمار، فردوس کالونی، وحید آباد، 100 کوارٹرز اور پرانے گولیمار میں لوگوں سے ہمارے رابطے بڑھے اور NAP کی میٹنگوں میں حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

حسن ناصر کہتے تھے اس الیکشن میں ہمیں جو مقاصد حاصل کرنے تھے ہم نے وہ حاصل کر لیے۔

1958ء میں ایوب خان کا مارشل لا لگا تو کامریڈ شرف علی ایک بار پھر روپوش ہو گئے۔ لیکن بدقسمتی سے زیادہ عرصہ روپوش نہ رہ سکے اور اپنے بھائی کی رہائش گاہ ڈالمیا کالونی سے گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتاری کے وقت اُن کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ پولیس کے معلوم کرنے پر انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ روپوش ہی نہیں تھے ورنہ اپنے بھائی کے اس نمایاں گھر پر موجود نہیں ہوتے۔ داڑھی کے سلسلے میں انہوں نے کہا کہ انہیں خارش ہو گئی تھی جس کی وجہ سے کچھ عرصہ شیو سے پرہیز کیا۔ اُنہیں لاہور کے شاہی قلعہ لے جایا گیا۔ اور تقریباً چھ ماہ بعد رہا کیا گیا۔

رہائی کے بعد ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پاکستان چلے گئے۔ کافی عرصہ بعد صدر

کے چائے خانے میں ملاقات ہوگئی۔ شادی کرلی تھی اپنے دفتر کا پتہ دیا۔ میں اکثر اُن کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ چائے پلاتے، کھانے کا وقت ہوتو کھانا کھلاتے اور واپسی پر دو روپیہ دے دیا کرتے، یہ سلسلہ کافی عرصہ جاری رہا۔ کبھی کبھی وہ پیار سے کہتے آ گیا ''بھتہ خور''۔ جہاں وہ کام کرتے تھے کچھ عرصہ میں نے بھی وہاں کام کیا تھا، اس لیے مجھے اُن کے پاس جانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔

1960ء میں میں گرفتار ہوا۔ رہائی کے بعد ملازمت کرلی اور اندرون سندھ منتقل ہو گیا۔ 10 سال بعد پھر کراچی واپس ہوا تو کامریڈ سے ڈاکٹر جبار خٹک کی شادی کے موقعہ پر ملاقات ہوئی۔ ہم ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، میں نے پارٹی کے حالات پر گفتگو کی اور استفسار کیا کہ کامریڈ یہ کیا ہو رہا ہے یہ کسی طرح ٹھیک ہوگا تو سامنے کی جانب بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے جب تک یہ سفید سر والے موجود ہیں یہ حالات یوں ہی رہیں گے۔ میں نے جذباتی انداز میں کہا تو پھر ہمیں ان کو راستے سے ہٹانے کا منصوبہ بنانا چاہیے۔ کہنے لگے پھر یہ ہیرو بن جائیں گے۔ جب تک نئی نسل اور نیا نوجوان خون شامل نہیں ہوگا تحریک کی یہ بیماریاں یونہی جاری رہے گی۔ لاہور میں مجھے اطلاع ملی کہ کامریڈ شرف علی وفات پا گئے ہیں۔ میں دیر تک ان کی یادوں میں گم ہوگیا۔

اُن کی گرفتاری کے سلسلے میں کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اُنھوں نے کامریڈ سجاد ظہیر کی تقلید کی تھی۔ اور خود گرفتاری دی تھی؟ بہر حال سوالات تو پیدا ہوتے ہیں۔

رہنمایوں کا اعزاز، قربانیوں کی نظیر: اعزاز نذیر

4 فروری 1998ء کی صبح 18 گھنٹوں کی بے ہوشی کا عالم حرکت قلب چار مرتبہ بند ہو کر بحال ہوئی سانس کا سلسلہ بار بار منقطع ہوا، نبض مسلسل ڈوبتی ابھرتی رہی، بستر مرگ پر موت سے پنجہ آزمائی کرنے والا یہ پاکستان کے مظلوموں اور محنت کشوں کا سورما اعزاز نظیر تھا۔ جس نے زندگی کے پچاس سال جبر، ناانصافی اور استبداد کے خداؤں سے برسر پیکار رہ کر گزار دیا۔ ساری زندگی جس نے دلیری، بہادری اور بے جگری سے مصائب کا مقابلہ کیا کبھی کسی مصلحت کوشی کا شکار نہ ہوا، ہمیشہ کلمہ حق بلند کیا اور ہر جابر و قہار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلے کے لیے للکارنا جس کا طرہ امتیاز تھا۔ یوں خاموشی سے موت کی آغوش میں چلا جائے ممکن ہی نہیں تھا۔ موت و زیست کی کشمکش طویل ہوتی گئی۔ خود معالجین کے لیے بھی حیرت و استعجاب کا باعث بننے والا یہ آخری معرکہ اُس وقت ختم ہوا جب ساڑھے دس بجے موت کے بے رحم ہاتھوں نے ایک بہادر انسان کی زندگی کو آ کر دبوچ لیا۔ موت اور حیات ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو زندہ نظر آتا ہے مر بھی رہا ہوتا ہے۔ لیکن زندگی ہمیشہ موت پر غالب رہی ہے کہ "موت ایک لمحہ ہے زندگی مسلسل ہے۔" وہ لوگ جو دوسروں کے لیے زندہ رہتے ہیں ابدی زندگی حاصل کر جاتے ہیں۔ اُن کی فکر، اُن کا جذبہ اُن کی تحریک، ایک سے دوسرے کو متاثر کرتی بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے۔ وہی عمل زندگی سے عبارت ہے۔ ایک ایسی زندگی جو معاشرے کی ناانصافیوں جبر، ظلم اور استحصال سے مظلوم و محکوم انسان کو آزادی اور تحفظ فراہم کرنے کا آدرش رکھتی، ہوا اعزاز نذیر اسی آدرش کی سچائی اور اُس کے بانکپن اور حسن کا اسیر ہو کر ہاتھ میں تیشہ فرہاد لئے وقت کے کوہ گراں سے خوشحالی، امن اور مساوات کی نہر نکال لانے کا عزم لے کر چلا تھا۔

اعزاز نذیر شہر حیدر آباد دکن کے محلے گوشہ محل میں 3 جنوری 1928ء کو ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے، اُن کے آباؤ اجداد کا تعلق حضرت غوث پاک کے خاندان سے تھا۔ اُن کے والد پیرزادے اور درگاہ حضرت عبداللہ شاہ صوفی کے سجادہ نشین تھے۔ اعلیٰ تعلیم اور روشن خیالی کے باوصف خاندانی روایات کے برعکس اپنے حلقہ بگوشیوں کو چھوڑ کر خاندان کے پہلے فرد کی حیثیت سے سجادہ نشینی کو ترک کر کے ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا اور ریاست میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ اُن کا نام شاہ محمد عزیز الدین ابواحمد صوفی قادری تھا۔ وہ حضرت بہاالدین شاہ صوفی کے فرزندِ ارجمند اور حضرت عبداللہ شاہ صوفی کے پوتے تھے۔ وہ صوفی مسلک ہونے کے ساتھ ساتھ قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار اور نظریات کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزاد کے پیروکار تھے۔ اعزاز نذیر کا خاندانی نام شاہ محمد اعزاز الدین ابواحمد صوفی تھا گھر میں ماں باپ ''بابو جانی'' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کچھ عرصہ گھر پر اور پھر اسکول میں حاصل کی۔ وہ فٹبال اور والی بال کے بہترین کھلاڑی تھے اور تن سازی کے شوق نے اُنہیں شہر میں دوسرے نمبر پر پہنچا دیا تھا۔ تقریری مقابلوں میں ہمیشہ درجہ اول میں رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں حیدر آباد اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم رکن رہے جس کے صدر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ و اور جنرل سیکرٹری ڈاکٹر علی جواد رضوی تھے۔ طالب علموں کی یہ انجمن ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کے زیر اثر کام کرتی تھی۔ جس کے دکن میں راہنما کامریڈ مخدوم محی الدین تھے۔ اسی تنظیم میں کامریڈ حسن ناصر بھی سرگرم تھے، اس طرح اعزاز نذیر کا ان سے ربط وضبط دکن ہی سے پیدا ہوا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تلنگانہ تحریک اپنے عروج پر تھی جس کی راہنمائی کسان سبھا کے کامریڈ روی نارائین ریڈی اور کامرید مخدوم محی الدین کر رہے تھے۔ طالب علموں کی یہ انجمن دیہاتوں اور شہروں میں رابطوں کا ایک ذریعہ تھی اور شہروں میں کسان تحریک سے ہمدردی پیدا کرنے اور پڑھے لکھے روشن خیال لوگوں کو باخبر رکھنے کے لیے خفیہ طور پر دیواروں پر تحریر (وال چاکنگ) کرنے اور گھروں میں خبر نامے پھینکنے کا کام انجام دیتی تھی۔ طالب علموں کے جلسوں میں اعزاز نذیر بہت جلد ایک شعلہ بیاں مقرر کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ ان کی شعلہ بیانی اور تقریر کی فصاحت و بلاغت کے چرچے عام ہونے لگے تو دیگر سماجی اجتماعات میں بھی اُنہیں مدعو کیا جانے لگا۔ اُن کا موصوع سماج کی ناانصافی، محنت کشوں

کا استحصال، دُکھی انسانیت اور اُس کی محرومیاں تھی۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد دکن ہی میں اُنہوں نے اپنی خواہش کے مطابق ایک فیکٹری میں ملازمت اختیار کر لی جس کا علم گھر والوں کو بعد میں ہوا۔ اس فیکٹری کی ٹریڈ یونین کے پلیٹ فارم سے اُنہوں نے مزدوروں کو اپنے حقوق کی آبیاری کے لیے اپنی تقریر کی سحر کاری سے خوب خوب متاثر کیا اور اُسی دن سے وہ ٹریڈ یونین کے مسلمہ لیڈر بن گئے۔ دوسری طرف ریاستی استبداد کے آلہ کاران کی خفیہ نگرانی کرنے لگے تھے۔ ایک موقع پر انتہائی پر جوش خطاب کے بعد ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے تو وہ مئی 1951ء میں چھپتے چھپاتے پاکستان کے شہر کراچی میں داخل ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب تلنگانہ تحریک واپس لی جا چکی تھی۔ کامریڈ مخدوم اور اُن کے ساتھی گرفتار ہو چکے تھے اور ریاستی استبداد کے آلہ کار بچے کچے سرگرم کارکنوں کا صفایا کرنے لگے تھے۔

پاکستان کی سیاسی صورتِ حال اُن دنوں نہایت پر آشوب تھی۔ نام نہاد راولپنڈی سازش کی آڑ میں ترقی پسند تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی تھی اور اُن کے تمام کارکنوں اور راہنماؤں کو ملک بھر سے چن چن کر گرفتار کر لیا گیا۔ جو لوگ گرفتار کئے گئے اُن پر ملک سے غداری کے مقدمات قائم کئے گئے۔ دوسری طرف تمام رجعت پسند سیاسی جماعتیں اور قوتیں موقع سے فائدہ اُٹھاتی ہوئی ان اسیر کارکنوں کو موت کی سزا دینے کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ جب کہ سرکاری اہلکاروں نے حکومت کی خوشنودی اور داد و تحسین حاصل کرنے کیلئے اپنی سرگرمیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا کردار ادا کرتے ہوئے ملک بھر میں خوف و دہشت کی فضا قائم کر رکھی تھی۔

حیدر آباد کالونی کے مکان نمبر 94 میں چند نوجوان جمع تھے جو ملک کی اس پر ہول اور مکدر فضا سے بے چین اور مضطرب تھے جن میں شاعر بھی تھے اور ادیب بھی، دکن کی طلبہ تنظیم کے ارکان بھی اور ٹریڈ یونین کے کارکن بھی۔ حبس اور گھٹن کی اس فضا میں تازہ ہوا کی آس لگائے مل بیٹھنے کی طرح ڈالی اور محفل علم و ادب کا قیام عمل میں آیا جس کے اراکین میں ابراہیم جلیس، حمایت علی شاعر، مسلم ضیائی، عبدالرؤف عروج، احمد رشدی، تحسین سروری، خواجہ معین الدین، قمر ساحری، اقبال احمد خان (جو بعد کو علامہ کے نام سے مشہور ہوئے) اعزاز نذیر سیّد احمد اور رؤف شیرازی شامل تھے۔ حیدر آباد کالونی کا مکان نمبر ۹۴ سیّد احمد کا تھا جو نہایت مرنجان مرنج پیکر ایثار، شریف النفس اور کم سخن واقعہ ہوئے تھے اور چھوٹے سے گھر کا یہ بڑا کمرہ جو بڑا نہیں کہا جا سکتا۔ دکن سے

آنے والے نوجوان ترقی پسندوں اور بے روزگاروں کی آماجگاہ مشہور ہوا جہاں دن کے کسی بھی وقت چائے، (۲) دووقت دال روٹی اور شب بسری کے لیے دری ہر وقت موجود رہتی۔

محفل علم وادب کی تنقیدی نشستیں ہر ۱۵ دن کے بعد بہادر جنگ ہائی اسکول کے کسی ایک کلاس روم میں منعقد ہوا کرتی تھیں جس میں علم وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک معقول تعداد پابندی سے شرکت کیا کرتی تھی۔ تنقیدی نشستوں میں شرکت کرنے والوں میں ایک کامریڈ عزیز سلام بخاری بھی تھے جو قریب ہی کہیں جمشید روڈ پر رہائش رکھتے تھے یہاں یہ تحریر کرنا برمحل ہوگا کہ کامریڈ عزیز سلام بخاری ایک سرگرم کیمونسٹ کارکن اور مارکسٹ تھے اور زندگی کے آخری لمحوں تک روپوش رہ کر سندھ کی مزدور اور کسان تحریکوں میں سرگرم عمل رہے وہ چھوٹے بخاری ASB اور مولانا کے ناموں سے پہچانے جاتے تھے۔ اعزاز نذیر نے ان ہی کی راہنمائی میں اپنے کام کی ابتدا کی لیکن چونکہ ملک کے حالات بہت غیر یقینی تھے اس لئے انہیں یہاں اپنے لئے کسی ایک محاذ کا انتخاب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ انہوں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا تاکہ طالب علموں کی تنظیم ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں خود کو سرگرم رکھا جاسکے۔ DSF میں اس وقت کے راہنماؤں میں ڈاکٹر رحمان علی ہاشمی، ڈاکٹر منظور احمد، ڈاکٹر محمد سرور، ڈاکٹر غالب، محمد شفیع ایڈووکیٹ، پروفیسر جمال نقوی، پروفیسر علامہ اقبال احمد خان بیرسٹر وودود، شیر افضل اور ڈاکٹر محبوب قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے DSF کو ترقی پسند بنیادوں پر منظم کر کے پورے ملک میں ایک فعال اور روشن خیال طلبہ تنظیم کے یونٹ قائم کیے اور ۸ جنوری ۱۹۵۳ء کی تحریک کے لیے بے مثل قربانیاں دے کر تاریخ میں ایک درخشاں باب کا اضافہ کیا۔

ٹریڈ یونین تحریک میں اُن دنوں کامریڈ نارائن داس بیچر، کامریڈ سوبھو گیان چندانی اور کامریڈ شرف علی اور کامریڈ محمد زبیر سرگرم تھے لیکن یہ سب گرفتار کئے جاچکے تھے اور ٹریڈ یونین کے دفتر واقع بندر روڈ میں کارکنوں کی آمدورفت معطل ہوگئی تھی۔

سیاسی میدان میں ان دنوں میں میاں افتخار الدین اور ان کی آزاد پاکستان پارٹی کا بڑا غلغلہ تھا۔ اعزاز نذیر نے آزاد پاکستان پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا ادھر محفل علم وادب کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو بھی حکومت وقت برداشت نہ کرسکی اور سرکاری اہلکاروں کی نظر التفات پڑنے لگیں۔ احباب آہستہ آہستہ بکھرنے لگے اور محفلیں سونی

ہونے لگیں۔ اعزاز نذیر کی طبیعت کی جولانی نے اپنے اظہار کے راستے مسدود پائے تو نئی وسعتوں کی تلاش میں سرگرداں لانڈھی انڈسٹریل ایریا کی طرف رُخ کیا یا پھر اسے تاریخ کا انتخاب کہیں کہ ایک تہی دست فاقہ مست سماج کی تبدیلی کا ایندھن بننے کی طرف کشاں کشاں از خود رواں دواں تھا۔ لانڈھی انڈسٹریل ایریا ٹرسٹ میچ فیکٹری حیدرآبادیوں کی فلاح و بہبود کے لیے میر لائق علی سابقہ وزیر اعظم حیدرآباد دکن کی سرپرستی میں قائم ہو چکی تھی۔ ٹرسٹ میچ فیکٹری میں ابتدا میں ماچس کی تیاری مشین کے ذریعے ہوا کرتی تھی جہاں سب سے پہلے مزدور یونین 1953ء میں قائم ہوئی۔ یہ مزدوروں کی پہلی یونین تھی جس کا تعلق آل پاکستان کنفیڈریشن آف لیبر کے سرپرست ایم۔ اے خطیب تھا۔ اس کے بانیوں میں حبیب بغدادی، عبدالسلام، ابراہیم شارق، رزاق مکیش، شیخ محمد کاظم، خواجہ نجیب الدین اور راقم الحروف تھے۔ یونین کے قیام کے بعد لانڈھی کے مزدوروں کی پہلی بھوک ہڑتال بھی اس یونین کے تحت عمل میں آئی اس ہڑتال کو فیکٹری کی انتظامیہ نے پولیس کے بے پناہ تشدد اور فیکٹری کے تمام کارکنوں کی برطرفی کے ذریعے فرد کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ 1953ء میں ٹرسٹ میچ فیکٹری میں اپنی پیداوار کے اضافے کے لیے ہاتھوں کے ذریعے ماچس بنانے کا شعبہ قائم کیا جسے کمنگ سیکشن کہا جاتا تھا۔ اس کے لیے کثیر تعداد میں مزدوروں کی بھرتی شروع ہوئی۔ اعزاز نذیر نے اس شعبے میں پروڈکشن سپروائزر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ کمنگ سیکشن کے مزدوروں کی اجرت مشینوں پر کام کرنے والوں سے کم رکھی گئی تھی اور انہیں روزانہ ایک مقررہ تعداد میں پیداوار دینا لازمی ہوتا تھا۔ اس شعبے میں عورتیں، بچے اور بوڑھے سب ایک ہی ضابطے کے تحت کام کرتے تھے جس میں کوئی تفریق یا تخصیص نہیں تھی۔

پیداوار کا ہدف پورا نہ کرنے والے کارکنوں کی اجرت کاٹ لی جاتی تھی جس کی وجہ سے کارکن بلا تھکان کام کیا کرتے تھے اور روٹی کھانے کے اوقات میں بھی کام کرنا پڑتا تھا ایک دن اعزاز نذیر کے سیکشن میں پیداوار کی مقررہ مقدار کے ہدف کو پورا نہ کرنے پر ان کے شفٹ انچارج نے انہیں اپنے دفتر بلوا کر کام سے عدم دلچسپی اور لا پروائی کے الزامات عائد کر کے تنبیہ کی، جس پر اعزاز نذیر نے مزدوروں پر عائد فیکٹری کی انتظامیہ کے غیر انسانی رویہ اور ظلم کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا اور اپنے سیکشن میں واپس آ کر تمام مزدوروں سے ان کی اور شفٹ انچارج کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ذکر کیا اور انہیں متحد ہو کر حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نہایت پُر

اثر اور پُر جوش تقریر کر ڈالی، جس کے نتیجے میں تمام کارکنوں نے کام بند کر دیا اور اعزاز نذیر کو اپنے کاندھوں پر بیٹھا کر فیکٹری سے باہر نکل آئے۔ فیکٹری انتظامیہ نے اپنی مدد کے لیے پولیس طلب کر لی مزدوروں پر لاٹھی چارج ہوا۔ مزدوروں نے سنگباری کی، لوگ زخمی ہوئے گرفتار ہوئے، انتظامیہ کا تشدد اور کارکنوں کے اشتعال کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک اعزاز نذیر کو لانڈھی بدر نہ کر دیا گیا اور ان کے ساتھیوں پر لانڈھی ملوں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ لانڈھی کے صنعتی علاقوں میں ظلم اور ناانصافیوں کے خلاف یہ پہلی چنگاری تھی جس نے بعد کے حالات میں بھڑ کے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہو کر مزدوروں کے حقوق کی جدو جہد کو حرارت اور توانائیوں سے معمور کیا۔ 1953ء کے اوائل میں پیش آنے والے واقعات جن میں 8 جنوری کی طلبا تحریک کو کچلنے کے لیے حکومت کا سفاکانہ اور پرتشدد مظاہرہ، محفل علم وادب کے کارکنوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا اور لانڈھی کے مزدور کارکنوں کے خلاف منتقمانہ کارروائیاں وہ عوامل تھے جنھوں نے سرگرم کارکنوں کو اندرون سندھ برسر پیکار رہنے پر مجبور کیا چنانچہ کامریڈ عزیز سلام بخاری، کامریڈ امام علی نازش، کامریڈ شرف علی اور کامریڈ سائیں عزیز اللہ کی راہنمائی میں درجنوں کارکن حیدر آباد، نواب شاہ، کوٹری، سکھر خیر پور، روہڑی، جیکب آباد اور لاڑکانہ جیسے سندھ کے اہم شہروں میں اپنے فرضی ناموں کے ساتھ وارد ہوئے۔ اور اپنے اپنے کام کی بنیاد پر کسی نے ہاری کمیٹی میں شمولیت اختیار کی، کوئی سیاسی سطح پر سرگرم ہوا تو کسی نے طلبا اور مزدور تنظیموں کو منظم کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ لانڈھی کے صنعتی علاقے سے بے دخل کئے جانے والے اعزاز الدین احمد جب خیر پور پہنچے تو ڈاکٹر نذیر بن چکے تھے۔ ان کے ساتھ لانڈھی میں کام کرنے والے کارکنوں کا ایک قافلہ بھی ہم رکاب تھا جس میں غوث علی، عبدالستار، مسلم عقیل، شیخ محمد کاظم، رزاق میکش اور راقم الحروف شامل تھے۔ خیر پور میں ان دنوں پیکر نقوی رہائی پا کر زیرِ زمین چلے گئے تھے، اعزاز نذیر کی روپوشی کا پہلا عرصہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ جو 1956ء تک جاری رہا۔ اعزاز نذیر نے خیر پور، سکھر اور روہڑی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ان علاقوں میں نہ صرف ٹریڈ یونین تحریک میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں بلکہ یہاں کی سیاسی اور ادبی سرگرمیوں کو بھی پروان چڑھایا۔ خیر پور میں ادبستان کے نام سے ایک علمی اور ادبی ادارے کا قیام، روہڑی میں سیمنٹ فیکٹری اور ریلوے کے ورکرز کی تنظیم نو سکھر میں طالب علموں کی تحریک اور سیاسی سرگرمیاں، ان کی اور کارکنوں کی انتھک

محنت اور جدو جہد کی بہترین مثال ہیں۔ جن دوستوں اور ساتھیوں نے ان سرگرمیوں میں حصہ لیا ان میں خیر پور سے علی مطاہر جعفری، سیّد باقر علی شاہ، علی اوسط جعفری، اسحٰق عباسی، شاہ محمد، ولی صدیقی، فصاحت حسین، اقبال احمد، جی ایم کُٹی، بیران کُٹی، ادبستان کے حسن حمیدی، علی عمران صدیقی، فاضل لودھی، سکھر کے فتح اللہ عثمانی، رکن الدین قاسمی، ابن ایوب، مظہر جمیل، مرغوب بخاری شیام کمار، لاڑکانہ کے مسلم شمیم، شعور صدیقی، روہڑی کے مولا بخش اور احمد علی قابل ذکر ہیں۔ روہڑی سیمنٹ فیکٹری کی تاریخی ہڑتال کا ذکر بہت ضروری ہے۔ جس میں مزدوروں کسانوں کے اتحاد کا ایک ولولہ انگریز مظاہرہ دیکھنے میں آیا جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جب فیکٹری میں ہڑتال شروع ہوئی تو انتظامیہ نے مزدوروں کو تنگ کرنے اور زچ کرنے کے لیے راشن ڈپو کا فیئر پرائس شاپ بند کر ڈالا جہاں سے مزدور ماہانہ سودا لیا کرتے تھے۔ اس کا جواب دینے کے لیے مزدور خاکروبوں نے افسران کے گھروں کی صفائی معطل کر دی جس کے نتیجے میں افسران کا رہائشی علاقہ تعفن اور بدبو میں ڈوب گیا دوسری طرف کارکنوں کے گھروں میں خورد و نوش کا سامان ختم ہونے لگا تو قرب و جوار کے کسانوں نے اپنے مزدور ساتھیوں کی مدد کی اور انہیں مفت اناج اور سبزیاں فراہم کر کے انتظامیہ کو اپنے مزدور دشمن فیصلہ کو واپس لینے پر مجبور کر دیا۔

اعزاز نذیر نے خیر پور، سکھر اور روہڑی سے پارٹی کے کل وقتی کارکن یعنی پیشہ ور انقلابی کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا تو انہوں نے دیرینہ خواہش کے مطابق مزدور طبقے کو منظم کرنے کا عظیم منصب منتخب کیا۔ جس کی ابتدا انہوں نے حیدر آباد دکن میں قیام کے آخری دنوں ہی سے دی تھیں اور بعد میں لانڈھی کی تحریک نے ان کے جذبے کو مزید مستحکم کیا۔

اعزاز نظیر نے ایک پیشہ ور انقلابی کی زندگی بسر کرنے کے لیے درمیانہ طبقے سے اپنا رشتہ توڑ کر مزدور طبقے سے جوڑنے کے لیے اپنے بود و باش اور طرز رہائش میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جو ساری زندگی ان کی علامات بن کر سامنے آئیں۔ انہوں نے خیر پور میں اپنی تعلیمی اسناد اپنے ساتھیوں کے سامنے نذر آتش کر دی اور یہ عہد کیا کہ وہ کبھی کوئی ملازمت اختیار نہیں کریں گے اور پارٹی کے کل وقتی کارکن کی حیثیت سے جدو جہد کو اپنا شعار بنا کر مصروف عمل رہیں گے جس پر وہ اپنی عمر کے آخری لمحوں تک قائم رہے۔ اس فیصلے سے ان کے خاندان کے تمام افراد جس میں والدین بھائی بہن شامل ہیں۔ معاشی بدحالی کا شکار رہے جس کو انہوں نے یہ کہہ کر باور کروا دیا کہ وہ ایک

بڑے خاندان جس میں تمام محنت کش شامل ہیں کی خوشحالی کے لیے کام کررہے ہیں۔ مزدور طبقے میں سیاسی شعور کی آبیاری ان کے اجتماعات میں ان کے مسائل کو سیاسی اور طبقاتی جدوجہد سے ہم آہنگ کرنے کے عمل کے دوران وہ ایک سرگرم سیاسی رہنما کے طور پر بھی مقبول اور معروف ہوئے۔ اس طرح ان کی شخصیت میں ایسی خصوصیت پیدا ہوگئی تھی جو بیک وقت ایک ہر دل عزیز مزدور رہنما بھی تھے اور ایک مقبول سیاسی کارکن بھی۔ جو اپنے جوش و جذبے اور فکر کی سچائیوں کو اپنے انداز بیاں کی روانی، لفظوں کے انتخاب کی چاشنی آواز کے زیروبم اور خطابت کی سحر انگریز و پُرکاری سے سننے والوں کے دل ودماغ پر گہرے اور عمیق اثرات مرتب کرتا چلا جارہا تھا۔

بہت جلد حیدرآباد میں جو سندھ کا دوسرا اہم شہر تھا، ایک طرف ٹریڈ یونین آفس قائم ہوا جس میں کام کرنے کے لیے شمیم واسطی، استاد جمن، قلندر بخش قاموس گل اور بشیر رحمت نے اپنی کل وقتی خدمات پیش کیں تو نیشنل عوامی پارٹی کے دفتر کے قیام اور اس کی تمام تر سرگرمیوں کا انحصار سیّد باقر علی شاہ وسیم عثمانی، اشفاق علی پیارے، اسحٰق عباسی اور راقم الحروف پر تھا۔ ان ہی دنوں سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا جس میں جام ساقی، میر تھیبو ندیم اختر، مہر حسین شاہ اور عنایت کاشمیری طالب علموں کی تنظیم سازی کا کام انجام دے رہے تھے۔ سندھ کی پارٹی کے تمام محاذوں پر سرگرم کارکنوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ون یونٹ کے خاتمے کے لیے ایسی مؤثر اور منظّم تحریک چلائی جو تاریخ کا ایک روشن باب ثابت ہوئی ہیں۔ ون یونٹ کے خاتمے کے لیے کارکنوں نے بھوک ہڑتالیں کیں پولیس کی لاٹھیاں کھائیں، تھانے میں بند ہوئے جب کہ ملک کے دوسرے علاقوں میں ون یونٹ کے خلاف شدید احتجاج کیا جارہا تھا اور اعزاز نذیر پورے ملک میں کارکنوں کے درمیان رابطے کا کام انجام دے رہے تھے۔ یہیں سے اعزاز نذیر قومی سطح کے رہنما بن کر اُبھرے۔ یہ ہی وجہ تھی بعد کو انہوں نے مولانا بھاشانی اور مادر ملت کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا اور عوام میں پارٹی کے موقف کی ترجمانی کی جس کی وجہ سے وہ پارٹی اسپوکس مین کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے رہے۔ اعزاز نذیر کا سیاسی سفر آزاد پاکستان پارٹی سے شروع ہوکر عوامی جمہوری پارٹی تک کی 47 سالہ سیاسی عمل کے تسلسل سے عبارت ہے۔ ملک بھر کے طول وعرض میں کوئی مزدور انجمن اور کوئی سیاسی پارٹی جو عوام کی خوشحالی کا پروگرام لے کر سامنے آئی اس کو اعزاز نذیر نے خوش آمدید کہا اور اس کے لیے کام کیا ان کا یہ یقین تھا کہ تبدیلی

کا عمل بتدریج ظہور پذیر ہوتا ہے اور تحریک منزل سے ہمکنار ہونے میں ایک ایک قدم کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ انھوں نے جب محسوس کیا کہ یہ پارٹی اب عوام کے مفادات کا تحفظ کرنے کی اہل نہیں رہی تو انھوں نے فوراً اسے خیر باد کہہ دیا اور دوسری پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ پاکستان کے ابتدائی دنوں ہی سے نوابوں جاگیرداروں اور انگریزوں کی خدمت گزار نوکر شاہی نے اقتدار پر اپنا تسلط قائم رکھا ہوا تھا۔ مسلم لیگ ایک واحد جماعت تھی جس نے بزعمِ خود پاکستان کے حصول اور اس کی تعمیر کا منصب اپنے کاندھوں پر اُٹھا رکھا ہوا تھا جو دراصل نوابوں اور جاگیرداروں کے آلہ کار تھے، کندھے مسلم لیگ کے استعمال ہو رہے تھے اور نشانہ بازی کوئی اور کر رہا تھا۔ کٹھ پتلیاں اور تھیں اور ڈوریاں ہلانے والے کوئی اور تھے۔ مسلم لیگ کی واحد سیاسی حریف آزاد پاکستان پارٹی تھی جس کے قائد میاں افتخار الدین تھے جو صاحب ثروت ہونے کے باوجود محبِّ وطن، عوام دوست، روشن خیال اور ترقی پسند فرد تھے۔

انہوں نے اپنے گرد تمام محبِّ وطن لوگوں کو جمع رکھا تھا۔ اعزاز نذیر جو ۱۹۵۱ء میں اس پارٹی میں شامل ہو چکے تھے اور بعد کو ان کا سیاسی سفر پاکستان کے سیاسی حالات کے ساتھ جاری رہا، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ان تمام لوگوں میں شامل تھے جو ملک کو ایک آزاد جمہوری اور سامراج دشمن پالیسیوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے۔ آزاد پاکستان پارٹی میں جب خان عبدالغفار خاں، جی ایم سیّد اور غوث بخش بزنجو نے ۱۹۵۶ء میں شمولیت اختیار کی تو اس کا نام نیشنل پارٹی رکھا گیا۔ اعزاز نذیر بھی اس پارٹی میں شامل تھے۔ مولانا بھاشانی، حاجی دانش اور پروفیسر مظفر احمد کی شمولیت نے اس کا نام نیشنل عوامی پارٹی رکھا جس میں سندھ سے محمود الحق عثمانی، سیّد رشید احمد اور اعزاز نذیر شامل ہوئے۔ یہ پارٹی ۱۹۵۷ء میں وجود میں آئی بھٹو کے دور میں نیشنل عوامی پارٹی پر نام نہاد عراقی اسلحہ اسکینڈل کا قیام اور پھر اس پر پابندیوں کے بعد ۱۹۷۵ء میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی شیر باز خان مزاری کی زیر قیادت وجود میں آئی۔ NDP نے ایک سال تک اپنی سرگرمیاں جاری رکھی مگر مزاری اور بیگم نسیم ولی خان سمیت سرحد کے تنگ نظر قوم پرستوں سے اعزاز نذیر کے ساتھیوں سے اختلافات پیدا ہو گئے تو ۱۹۷۷ء میں اعزاز نذیر کی صدارت میں نیشنل پروگریسو پارٹی کا قیام عمل میں آ چکا تھا جس کے جنرل سیکریٹری افراسیاب خٹک تھے۔ ۱۹۷۹ء میں لاہور میں NAP، مزدور کسان پارٹی سردار شوکت گروپ، نیشنل پارٹی نے عوامی نیشنل پارٹی قائم کی

تو اعزاز نذیر نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ پھر 1991ء میں کمیونسٹ پارٹی سے علیحدہ ہونے والے مختار باچا، افراسیاب خٹک، لطیف آفریدی نے قومی انقلابی پارٹی بنائی تو اس میں بھی اعزاز نذیر شامل تھے۔۱۹۹۲ء میں انیس ہاشمی کی پاکستان ورکرز پارٹی اور عابد حسن منٹو کا گروپ سوشلسٹ پارٹی سے علیحدہ ہو کر بائیں بازو کے کچھ اور گروپوں کے ساتھ عوامی جمہوری پارٹی تشکیل دی، اعزاز نذیر اس پارٹی کے صوبہ سندھ کے آرگنائزر بنے۔ اس سے قبل ۱۹۹۰ء میں اعزاز نذیر نے کمیونسٹ پارٹی کے چند ایک مرکزی رہنماؤں کی آمرانہ روش کے خلاف اپنے اصولی اختلاف کا علم بلند کیا۔ کمیونسٹ پارٹی خود ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی جمال نقوی اور جام ساقی نے کمیونسٹ پارٹی میں مارکس ازم سے انحراف کرتے ہوئے علیحدگی اختیار کی تو اعزاز نذیر نے ایک بار پھر کمیونسٹ پارٹی کو رجوع کیا اور ۱۹۹۷ء میں ایک خط کے ذریعے پارٹی میں دوبارہ سرگرم ہونے کی خواہش ظاہر کی اس عرصے میں کیمونسٹ پارٹی سے علیحدگی ان کے اعصاب پر شدید دباؤ کا باعث بنی رہی اور انہیں یہ احساس تھا کہ انہوں نے پارٹی کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا وہ شدید مایوسی اور ڈپریشن کا شکر رہنے لگے۔ دوسری طرف سوویت یونین میں کمیونسٹ پارٹی کی تباہ کن حکمت عملیوں نے ان کی ذہنی کیفیت کو بے حد متاثر کیا۔ ایک دن وہ کارکنوں کے درمیان بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا جسے انھوں نے نہایت ہمت اور حوصلہ سے برداشت کیا۔ وہ فالج سے اپنے جسم کے متاثرہ حصوں کو دوبارہ بحال کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے وہ دن رات اپنے پیروں کو حرکت دیتے رہتے جس کے نتیجے میں وہ کھڑے ہونے اور چلنے کے قابل ہو گئے۔ جو ڈاکٹروں کے مطابق قوت ارادی کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ تھا۔ اس دوران ان کی بیوی تنویر فاطمہ کو گردے کا کینسر تشخیص ہوا جو نہایت پریشان کن صورتحال تھی، ان کا آپریشن کر کے کینسر زدہ گردے کو نکال دیا گیا۔ بیوی کی علالت جاری تھی کہ ان کے بیٹے حسین فاطمی کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک خطرناک آپریشن ہوا جس کے لیے ڈاکٹر پس و پیش کر رہے تھے اور اسے تقریباً ڈیڑھ ماہ ہسپتال میں گومگو کی کیفیت میں رہنا پڑا۔ حسین فاطمی جو اعزاز نذیر کا واحد کفیل تھا، زیر علاج ہی تھا کہ UBL نے اسے نوکری سے فارغ کر دیا۔ بیوی کی بیماری پر انہیں فالج کا دوسرا حملہ ہوا اور بیٹے کی بیروزگاری کی خبر سن کر دل کے حملے میں مبتلا ہوئے۔ وہ ایک چھوٹے سے بوسیدہ فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ جس میں بنیادی سہولتیں مفقود تھیں۔ یوٹیلیٹی کے بلز ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے کبھی

بجلی کی ترسیل منقطع ہو جاتی تو کبھی سوئی گیس کٹ جاتی۔ ٹیلی فون جو فلیٹ میں پہلے سے موجود تھا ان کے آباد ہو جانے کے بعد سے کبھی بھی بول کر نہیں دیا۔ وہ نہایت کسمپرسی کی حالت میں بے یار و مددگار اپنے حالات کا مقابلہ کر رہے تھے جس میں ان کی رفیقۂ حیات برابری سے شریک رہیں ایک انقلابی کی زندگی کی ہمسفر تو تھی بلکہ ہر طرح اس کو بھگت رہی تھی کہ بہو شہناز بھی ان حالات کو اپنا مقدر جان کر اسی جنجال میں شامل ہو گئی۔ اس گجراتی کہاوت کے مطابق ''چمگادڑ کے گھر چمگادڑ جائے تو خود بھی اُلٹی لٹک جائے'' حسین فاطمی سنہری مصافحہ کا شکار ہو گئے۔ اعزاز نذیر کا یہ خاندان ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بے حد مصائب و آلائم کا شکار رہا ہے لیکن اس بات سے بہت مطمئن ہے کہ وہ ایک ایسے انسان کے کنبے کے فرد ہیں جس نے تاریخ کے انتخاب پر پورا اُتر کر استحصالی قوتوں سے زندگی کے کسی موڑ پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ مارکسزم کو ایک ایسی سماجی سائنس تصور کرتے تھے جو کسی عقیدے اور جمود کا متحمل ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ معاشرے کی تبدیلی اس کے تضاد کی نوعیت کے مطابق عمل میں آتی ہے جو غیر محسوس طریقہ سے جاری رہتی ہے۔ سماج کی تبدیلی کے لیے معروضی حالات اور تاریخی عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ایک انقلابی تاریخ کے تقاضوں کا ادراک کرتے ہوئے تبدیلی کے عمل کو تیز کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اعزاز نذیر نے مختلف موقعوں میں مجموعی طور پر تقریباً دس سال روپوشی کی زندگی بسر کی جب کہ بارہ سال مختلف اوقات میں مختلف عرصوں کے لیے پابند سلاسل رہے۔

کراچی اور حیدرآباد کی جیلوں کے علاوہ وہ ملک بھر کی تمام خطرناک جیلوں مثلاً مچھ جیل، میانوالی جیل، خیر پور جیل، سکھر جیل کوٹ لکھپت اور ڈیرہ غازی خان جیل میں قید سخت وقید بامشقت کے سزایافتہ رہے۔ ہر حکومت جو بھی برسرِ اقتدار ہی، اعزاز نذیر کی حق گوئی و بے باکی کے عوض انہیں گرفتار کر کے خطرناک قیدیوں کی طرح ہتھکڑیوں اور ڈنڈا بیڑیوں کے ساتھ باندھ کر رکھتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ قائدِ عوام کے عرصہ اقتدار میں بھی اعزاز نذیر پسِ زنداں ہی رہے۔ قائد عوام کی خواہش تھی کہ عوام میں یہ مقبول کارکن ان کی پارٹی میں شامل ہو کر ان کے طوفانی دوروں میں ان کے ساتھ رہے جب کہ اعزاز نذیر ان کی اصلاحات اور لیبر پالیسوں کو اپنی تنقید کا ہدف بناتے رہتے تھے۔ جیل کے اندر بھی وہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف اصلاحی تحریکوں کے موئد و محرک رہے جس کی پاداش میں انہیں جیل کے حکام طرح طرح کی تکلیفیں دیا کرتے تھے۔ کھانے کے

لیے گلی سڑی اشیا پینے کے لیے سندھ کا کلرزدہ پانی دیا جاتا رہا جس کی وجہ سے ان کے گردے خراب ہو گئے۔ روپوشی کے دوران انہوں نے سخت ترین حالات کا مقابلہ کیا خود کو خفیہ پولیس اہلکاروں کی نظر سے محفوظ رکھنے کے لیے مسلسل سفر میں رہنا، میلوں پیدل چلنا اور چلنے کے لیے جنگل اور ویرانوں کو منتخب کرنا، اکثر خطرناک ڈاکوؤں سے ان کی مڈبھیڑ ہو جایا کرتی تھی جو بعد میں ان کے ہمدرد بن جایا کرتے تھے اور راستوں کی نشاندہی میں ان کی مدد کرتے وہ اپنا حلیہ تبدیل کرنے میں ایسی مہارت سے کام لیتے کہ خود ان کے ساتھی انہیں نہیں پہچان سکتے تھے۔ وہ آبادیوں میں پولیس کی نفری کے سامنے سے آم اور کیلوں کا ٹوکرا سر پر رکھ کر گزر جایا کرتے تھے۔ وہ جرأت دلیری اور بہادری کے لیے بے حد مشہور تھے اور پولیس ہمیشہ ان سے خوفزدہ رہتی تھی اور انہیں گرفتار کرنے کے لیے بھاری نفری اور جدید اسلحہ لے کر آتی تھی۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے عرصے میں انہوں نے پارٹی ریکارڈ کو اس وقت اپنی تحویل میں لیا جبکہ چاروں طرف سے پولیس نے گھیرا ڈالا ہوا تھا اور ذرا سی غلطی انہیں ہلاکت میں ڈال سکتی تھی۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے سٹی تھانے میں راقم الحروف سے، جو پمفلٹ کیس میں قید تھا، ملاقات کرنے کے لیے چلے آئے جب کہ وہ خود روپوش تھے اور یہ کہہ کر ہنستے رہے کہ میں نے پولیس والوں کو خود ان کی نفسیات کا سہارا لے کر جل دے دیا۔ مجھے سگریٹ پلایا اور گارڈ کو بھی پیش کیا اور غائب ہو گئے۔ پروفیسر جمال نقوی رقم طراز ہیں کہ اعزاز نذیر نے کامریڈ حسن ناصر کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے پارٹی سے اجازت طلب کی تھی، جس کو پارٹی نے سراہتے ہوئے اس لئے رد کر دیا کہ وہ ان کی زندگی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ اعزاز نذیر نے 1980ء میں لانڈھی اور کورنگی سے الیکشن بھی لڑا، ان کا نشان جھگی تھا۔ وہ پورے علاقے میں سائیکل پر بیٹھ کر اپنے ووٹروں سے ملاقات کرتے اور ایک دن میں ایک ایک درجن جلسوں اور کارنر میٹنگوں سے خطاب کرتے، ان کے ووٹر ان کے کارکن تھے۔ وہ اعزاز نذیر کے ساتھ چلتے رہتے ایک جلوس کی شکل میں اور جب کہیں رک جاتے تو یہ ہی جلوس جلسہ میں تبدیل ہو جاتا۔

الیکشن کی مہم اپنے عروج پر تھی کہ عین الیکشن سے کچھ دن قبل انہیں گرفتار کر لیا اور الیکشن کے بعد انہیں رہائی ملی۔ ان کے الیکشن کے انچارج ڈاکٹر منظور تھے جب کہ پروفیسر اقبال احمد خان، غوث علی، بی ایم کٹی، شرف الدین اسماعیل فردوسی اور راقم الحروف نے الیکشن آفس میں ڈیرہ

ڈال دیا تھا۔ اعزاز نذیر نے ساری زندگی تنگ دستی اور عسرت میں گزاری۔ ان دنوں پارٹی کے کل وقتی کارکن کو اتنی اجرت ملا کرتی تھی جتنی کہ ایک غیر ہنر مند مزدور کی تھی۔ پارٹی کے یہ تمام کل وقتی کارکن جن میں حسن ناصر، عزیز سلام بخاری، امام علی نازش، شرف علی اور سائیں عزیز اللہ شامل تھے۔ بدھوں اور بھکشوں کی زندگی گزارا کرتے اوہ اپنا کھانا اور کپڑا لوگوں سے مانگ کر استعمال کیا کرتے کھانے کے لیے اعزاز نذیر کو جو کچھ بھی مل جائے خاموشی سے کھالیا کرتے، لذت اور ذائقہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس چیز سے پیٹ بھر جائے وہ ہی ان کے لیے بہتر ہوتی۔ کپڑوں کے معاملے میں بھی پسند کا سوال یوں پیدا نہیں ہوتا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت کم اپنا سلا ہوا کپڑا اپنے جسم کے ناپ کے مطابق پہنا۔ جس کو اکثر ان کی بیوی خود اپنے ہاتھ سے سی کر دیا کرتی تھی، وہ اس جوڑے کو بمشکل چند دن پہننے کے بعد اپنے ہی کسی ساتھی کو جس کو ضرورت ہوتی، دے دیا کرتے۔ انہیں پوری زندگی کبھی بھی نیا جوتا پہننا نصیب نہیں ہوا وہ دوسروں کے استعمال شدہ جوتے پہنتے تھے جس کی وجہ سے اکثر ان کے پیر زخمی رہتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جیل جانے کا ایک فائدہ جیل کے کپڑوں کی صورت میں مل جاتا ہے۔ وہ چارپائی کی بجائے نیچے فرش پر سونا پسند کرتے جس کے لیے دری یا دلائی کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ وہ روپوشی کے عرصے میں سگریٹ نوشی ترک کر دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جیل میں کسی قسم کی عادت قیدی کی کمزوری کا باعث بن جاتی ہے۔

اعزاز نذیر نے ۱۹۵۹ء میں سکھر کے ایک روشن خیال خاندان میں شادی کی۔ معروف شاعر و ادیب مظہر جمیل اور سکھر کے طالب علم رہنما ظفر الحق ان کے برادر نسبتی ہیں۔ ان کی اہلیہ نے شادی کے بعد تنگ دستی، عسرت اور پریشانی کے عالم میں بسر کی۔ وہ شوہر سے جیلوں میں ملاقات کرنے کے لیے تنہا شہروں میں ڈھونڈتی پھرتی۔ کبھی ایک جیل کبھی دوسری جیل، اکثر ایسا بھی ہوا کہ انہیں حکومتی اہلکار تنگ کرنے کے لیے غلط اطلاعات دے کر غلط شہروں میں بھیج دیا کرتے۔ وہ اپنے شوہر کے خیالات اور ان کی سیاسی زندگی سے بہت متاثر رہیں اور خود بھی اپنے شوہر کے دوش بدوش جمہوری تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ سندھ میں انجمن جمہوریت پسند خواتین کی صدر رہ چکی ہیں۔ ان کے تین بیٹوں میں ایک بیٹا ان کے ساتھ رہتا ہے جو بیروزگاری کی وجہ سے کفالت سے محروم ہو گیا ہے۔ آج جب کہ ملکی قیادت پر طفل مکتب پالنے میں بیٹھ کر انگوٹھا چوسنے

والے سیاست کے گدی نشین گھٹنوں کے بل چلنے والے سیاسی نونہال سونے کا چمچہ منہ میں لے کر ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے صاحب کمال، لاشوں کی سیاست کرنے والے قتال، مسلط ہیں تو محنت کشوں، کسانوں، مظلوموں اور محکوموں کی خوشحالی کے لیے کام کرنے والا، ان کے حقوق کی بحالی کے لیے جدوجہد کرنے والا اُن کی آرزوؤں اور اُمنگوں کی پامالی کے خلاف سینہ سُپر ہونے والا اپنی پوری زندگی ایک مثالی غیر طبقاتی وغیر استحصالی معاشرے کے قیام کے لیے وقف کر دینے والا اعزاز نظیر ایک ایسا میر کارواں تھا جسے ہر دور میں رہنمائی کا اعزاز حاصل رہا اور جس نے قربانیوں کی وہ نظیر پیش کی جو عرصہ دراز تک اپنی یاد دلاتی رہے گی۔ وہ آج بھی محنت کشوں کا سرخ پرچم اوڑھے محوخواب ہے، ایک ابدی حیات کا تسلسل ہے جو لاکھوں انسانوں میں زندگی کی مسرتیں بانٹنے کا آدرش لے کر پیدا ہوا تھا۔

''موت ایک لمحہ ہے زندگی مسلسل ہے اور میں کہ زندہ ہوں آنی والی نسلوں میں''

کامریڈ سائیں عزیز اللہ

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

عزیز اللہ انصاری جو عرف عام میں سائیں کے نام سے مشہور و مقبول ہوئے، پاکستان کی قومی سیاست کے چند نہایت اہم رہنماؤں میں سے تھے۔ انہوں نے عوامی لیگ کے پلیٹ فارم سے مغربی پاکستان میں اپنی عوامی سیاست کے ذریعے جو وقعت و عزت پیدا کی وہ ان کی بے پناہ محنت، ایمانداری و دیانتداری کی مرہونِ منت ہے۔ یہ مقام بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ حسین شہید سہروردی انہیں اپنا دستِ راست کہا کرتے تھے جبکہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی یہ مقام حاصل تھا۔ جب سہروردی پاکستان کے وزیراعظم بنے تو اہلِ کراچی نے فریئر ہال گارڈن میں ان کے لیے ایک استقبالیہ منعقد کیا۔ سہروردی نے اس جلسہ گاہ میں کھڑے ہو کر اپنے گلے سے پھولوں کے ہار اتار کر سائیں عزیز اللہ کے گلے میں ڈال دیا اور تالیوں کی گونج میں کہا کہ اس محبت، عزت اور اعزاز کے صحیح حقدار عزیز اللہ ہی ہیں۔

ایک نچلی سطح پر گلیوں اور محلوں میں کام کرنے والے سیاسی کارکن کے لیے قومی سطح کی پذیرائی کا یہ واقعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جو سائیں عزیز اللہ کے سیاسی تدبر اور فہم و تفہیم کے اعتراف کا بین ثبوت تھا۔ وہ عوامی لیگ کے رہنماؤں میں واحد فرد تھے جن کے پاس رہنے کو اپنا ذاتی مکان نہیں تھا بلکہ وہ جیکب لائن کی جھونپڑیوں میں قیام پذیر تھے۔ بعد کو جب یہ جھونپڑیاں اٹھوا کر ان کے مکینوں کو شاہ فیصل کالونی میں آباد کیا گیا تو سائیں بھی شاہ فیصل کالونی میں منتقل ہو گئے۔ پانچ مرلہ کا وہ مکان جس کے در و دیوار آج بھی ان کی پوری سیاسی زندگی میں غربت و عسرت

کے ساتھ صبر واستقامت کی ایک طویل داستان بیان کرتے ہیں جو اہلِ فکر واہلِ نظر کے لیے ایک تازیانے سے کم نہیں۔ وہ عظیم انسان جس کو ملک کا وزیر اعظم اپنا دستِ راست بیان کرتا ہے وہ اپنی زندگی میں کسی آسودگی کے لیے مراعات حاصل کرنے کو اپنی شان درویشی کے خلاف سمجھتا ہے۔ ایسی اخلاقی عظمت و رفعت کی حامل شخصیت جو حسرت موہانی کی زندگی کی جیتی جاگتی مثال پیش کرتی ہے، ایک عام سیاست کے طالب علم کے لیے وجہ چیستاں ہو تو سُنیے کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک کل وقتی کارکن تھے۔ جو ساٹھ روپیہ ماہوار اجرت پر گزر بسر کرتے تھے۔ یہ کمیونسٹ پارٹی ہی تھی جس نے سائیں عزیز اللہ کو عوامی لیگ میں کام کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ ایک کمیونسٹ کے لیے اپنے آدرش کی خاطر جان سے گزر جانا تو ممکن ہے لیکن ذاتی مفاد کا راستہ اختیار کرنا امرِ محال ہے۔

سائیں عزیز اللہ کا ایک تاریخی کردار یہ تھا کہ اُنھوں نے سندھ کی کمیونسٹ پارٹی جس کے سربراہ کامریڈ حسن ناصر تھے کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی سے منسلک کروادیا۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں کامریڈ مونی سنگھ اور کامریڈ طوحہ اس کے مرکزی رہنما تھے۔ جو زیرِ زمین کام کرتے تھے۔ ادھر مغربی پاکستان میں سن 1954ء کے بعد سے پارٹی کی کوئی مرکزی تنظیم موجود نہیں تھی، کامریڈ حسن ناصر نے صوبہ سندھ میں پارٹی کو از سرِ نو منظم کر کے سائیں عزیز اللہ کے سپرد یہ کام تفویض کیا جس کو سائیں نے نہایت حسن وخوبی و کمال احتیاط وراز داری سے انجام دیا۔ اپنے فرض کی انجام دہی میں انھوں جس مہارت کا اظہار کیا وہ بے مثال ہے۔ اسی سن 1957ء میں سائیں عزیز اللہ کو کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی تنظیمی کمیٹی کا رکن نامزد کیا گیا۔ سائیں عزیز اللہ مشرقی اور مغربی حصوں کی کمیونسٹ پارٹیوں کے درمیان رابطوں کا ذریعہ بھی تھے۔

سائیں عزیز اللہ کا دوسرا تاریخی کارنامہ یہ تھا کہ جب مولانا بھاشانی پہلی مرتبہ مغربی پاکستان تشریف لائے تو کراچی ائیر پورٹ پر سیاسی کارکنوں اور تمام سرکردہ رہنماؤں کا ایک اژدھام موجود تھا۔ سائیں عزیز اللہ مولانا بھاشانی کو اس جمعِ غفیر سے نکال کر سیدھے اپنی رہائشگاہ شاہ فیصل کالونی لے آئے، جہاں ایک اور دوسرا اجتماع موجود تھا جس میں تمام ترقی پسند کارکن شامل تھے۔ مولانا بھاشانی کو یہاں لانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ انہیں اپنی طرزِ رہائش و بود و باش سے واقفیت کروانا چاہتے تھے تاکہ بھاشانی انہیں صحیح طور پر سمجھ سکیں اور دوسری طرف پارٹی کے

کارکنوں سے روشناس کروانا مقصود تھا جو وہاں پر بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یہیں پر مولانا بھاشانی کا تعارف ڈاکٹر اعزاز نذیر سے کروایا گیا جنہیں پارٹی نے مولانا کے ساتھ مغربی پاکستان کے دورے میں شریکِ سفر ہونے کا مینڈیٹ دیا تھا۔ یہ ایک اہم فیصلہ تھا جس کی وجہ سے پارٹی پورے پاکستان بھر میں اپنے موقف سے نہ صرف پہچانی جانے لگی بلکہ جگہ جگہ اس کی تنظیم بھی درست ہوتی گئی جس میں اعزاز نذیر کی فکری جولانی اور شعلہ بیانی نے اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح مولانا بھاشانی کو گندم نما جوفروشوں اور عوام دشمن طاقتوں کے نرغے میں پھنس جانے سے بچایا اور مستقبل میں ان کے دوروں سے ہونے والی عوامی بیداری کو ممکن بنایا۔ ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے سائیں عزیز اللہ کی حاضر دماغی اور معاملہ فہمی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

سائیں عزیز اللہ شاہ فیصل کالونی میں رہتے ہوئے اس سے ملحقہ پاکستان سیکورٹی پریس، پی آئی اے اور سول ایوی ایشن کے اداروں میں ہر دل عزیز شخصیت شمار ہونے لگے تھے، ان کے رفیقوں میں طفیل عباس، ڈاکٹر منظور احمد، اظہر عباس، اسماعیل یوسف، ذکی عباس، محبوب علی اور محمد فصیح وغیرہ شامل تھے جنھوں نے نہایت بے جگری سے راستہ کی رکاوٹوں کو توڑتے اور پھلانگتے اپنے مخالفین کو منہ توڑ جواب دیتے ہوئے عوام کے لیے بے لوث خدمت کی شاندار مثالیں پیش کی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ شاہ فیصل کالونی اور اس کے گردونواح کا پورا علاقہ ترقی پسندوں کا گڑھ سمجھا جانے لگا تھا۔

سائیں عزیز اللہ کے مخالفین یعقوب اجملی، اختر علی خان، جمال حسین شیرازی، منظور الحق جن کا تعلق رجعت پسندوں کے گروپ سے تھا اس صورتحال سے نہ صرف خوف زدہ تھے بلکہ وہ انہیں نقصان پہنچانے کے درپے رہا کرتے تھے۔ حسین شہید سہروردی جو کہ گرگِ باراں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ مشہور تھے۔ سائیں عزیز اللہ پر اپنا اعتماد جاری رکھے ہوئے تھے اور انہیں ان کی پوری تائید اور حمایت حاصل تھی۔ ایک دن سہروردی نے سائیں عزیز اللہ سے کہا کہ امریکی ادارے FBI کی رپورٹ ہے کہ عزیز اللہ کمیونسٹ ہے، مجھے یہ بات امریکی سفیر ہیلڈ رتھ نے بتائی ہے۔ میں نے سختی سے اس کی تردید کردی ہے چونکہ ہمارے ملکی ادارے بھی میری تائید کرتے تھے۔ ادھر شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی یہ لوگ کمیونسٹ سمجھتے ہیں اور کہا کہ عوامی انداز کی سیاست کرنے والے ہمیشہ امریکیوں کے لیے شکوک پیدا کرتے رہے ہیں۔

ان دنوں ملک کا سیاسی منظر نامہ پاکستان کے مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا ملک میں امریکی اثر ونفوذ غالب آ چکا تھا۔ تمام وزارتیں امریکی سفیر کی ہدایات پر بنتی اور بگڑتی تھیں۔ ملک سیٹو، سینٹو اور بغداد پیکٹ کا آلہ کار بن چکا تھا۔ مسلم لیگ میں جاگیرداروں اور زمینداروں کے حاشیہ بردار اور نمک خوار روسی بلاک کے خلاف زہر افشانی میں ایک دوسرے سے بازی لے جا رہے تھے اور امریکی بلاک سے خود کو منظور اور مقبول بنانے میں رطب اللسان تھے۔ دوسرا گروپ مذہبی جماعتوں کا تھا جو امریکہ کی نہ صرف تائید کرتے تھے بلکہ اکثر جماعتیں زرخرید گماشتوں کا کردار ادا کرتی تھیں۔ تیسرا گروپ ملک کے ان محب وطن سیاسی رہنماؤں پر مشتمل تھا جنھوں نے اپنی علاقائی وقومی جماعتوں کو ختم کر کے ایک ملک گیر عوام دوست تنظیم بنائی اور غیر جانبداری کو اختیار کرنے کے لیے ابتدا میں آزاد پاکستان پارٹی بنائی اور پھر عوامی لیگ سے نیشنل پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے قیام تک کی جدوجہد میں تاریخی کردار ادا کر رہے تھے۔ جن میں سائیں عزیز اللہ جیسے بے لوث دیانتدار اور سیاسی فکری بالغ نظری کے حامل کارکنوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

دراصل سائیں عزیز اللہ ایک ایسے عوامی سیاسی کارکن تھے جو عوام کے درمیان ان کی جھونپڑیوں میں، ان کے کچے گھروں میں رہتے تھے۔ گندی نالیوں کے بدبودار راستوں میں پیدل سفر کرتے، دن رات ان کے ساتھ اٹھتے، بیٹھتے انہیں ان کی محرمیوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کے لیے تیار کرتے غربت اور نکبت کی وجوہات بیان کرتے، حق وانصاف کی لڑائی کو تیز کرتے اور ہمیشہ انہیں بہتر معاشرہ کے لیے دنیا بھر میں ہونے والی جدوجہد سے روشناس کرواتے جس سے عوام کے دلوں میں ان کے لیے نہایت عزت واحترام کا درجہ حاصل ہوا اور وہ ان سے پیار کرنے لگے اور یہی ایک سچے کمیونسٹ کا معاشرے میں کردار ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی عوام حفاظت کرتے ہیں اور ان کو اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں، ان پر حکومت بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ یہی وجہ تھی کہ سائیں ہمیشہ گرفتاری سے بچے رہے۔ یہاں تک کہ ایوب خان کے مارشل لا کے دوران پورے ملک میں بائیں بازو کے لوگوں کو گرفتار کیا گیا لیکن سائیں عزیز اللہ آزاد رہے اور اپنے عوام کے درمیان رہے جو ان کی طاقت کا مرکز اور سرچشمہ تھے۔ ڈاکٹر اعزاز نذیر بھی ان دنوں میں گرفتار نہیں ہوئے کہ ان کے پیچھے بھی محنت کشوں کی بہت بڑی طاقت موجود تھی۔ جب

عوامی لیگ نیشنل عوامی پارٹی میں ضم ہوگئی تو سائیں عزیز اللہ سندھ کے کسانوں میں کام کرنے کے لیے کامریڈ عبدالقادر اور کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے ساتھ ہاری کمیٹی میں سرگرم ہو گئے۔ صوبہ سندھ میں کسانوں کے حقوق کے حصول کے لیے اور ان کی تنظیم کو مؤثر بنانے کے لیے 1957ء میں منعقدہ سرہاری سندھ کانفرنس کامریڈ عزیز سلام بخاری کی کوششوں سے منسوب ہے تو سن 1968ء کی سکرنڈ ہاری کانفرنس کی کامیابی کا سہرا بھی سائیں عزیز اللہ کے سر ہے۔ ہاری کمیٹی میں کام کرنے ہی کے دوران انہیں سائیں کے محترم نام سے نوازا گیا۔ اس امر کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے کہ جب سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم بنے تو اُنھوں نے سائیں عزیز اللہ کو طلب کر کے پوچھا کہ بتاؤ مجھے سب سے پہلے کون سا کام کرنا چاہیے؟ سائیں نے کہا کہ اس وقت کراچی میں بے شمار طالب علم رہنما قید ہیں ان کی رہائی کے احکامات صادر کیجیے۔ سہرودی نے کراچی کے ایڈمنسٹریٹر کو طلب کر کے حکم دیا کہ شام تک تمام طالب علموں کو رہا کر دیا جائے۔ شام کے ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا اس حکم پر عمل درآمد کرنے کے لیے ایڈمنسٹریٹر بھاگم بھاگ کراچی سنٹرل جیل پہنچ گیا اور یوں تمام طالب علم رہنما جیل سے رہا ہوئے۔

اب دیکھتے ہیں کیا گزرتی ہے آلام و مصائبِ روزگار سے اس قطرے پر گوہر ہونے تک۔ سائیں عزیز اللہ 1918ء میں علی گڑھ کے تاریخی شہر میں پیدا ہوئے، خاندانی ماحول اگرچہ مذہبی تھا لیکن روشن خیالی عام فکری رجحان پر غالب تھی۔ ابتدائی تعلیم مقامی سکول سے پائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے معروف محمڈن اورنٹیل کالج میں داخلہ لیا۔ اسرار الحق مجاز ان کے ہم مدرسہ تھے۔ ملکی سیاست سے دلچسپی پیدا ہوئی تو کانگریس میں شامل ہو گئے لیکن پنڈت نہرو کے ہندوستان کی تقسیم کو قبول کر لینے پر کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ آل انڈیا کسان سبھا میں کام کرنے لگے جہاں ان کی ملاقات نارائین دت تیواڑی سے ہوئی جنہوں نے انہیں سوشلزم کی طرف راغب کیا۔ 1950ء میں پاکستان تشریف لائے اور کامریڈ جمال الدین بخاری اور کامریڈ سوبھو گیان چندانی سے رابطہ کر کے جیکب آباد کو اپنا مستقر بنایا۔ جیکب آباد میں عبدالخالق آزاد، ابوالحسن اور برکت علی آزاد کے ساتھ مل کر خفیہ طور پر مارکسسٹ اسٹڈی سرکل قائم کیا اور یہیں ایک مقامی سکول میں مدرسی اختیار کر لی۔ لیکن جلد ہی سکول کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے کہ اس سکول کا ہیڈ ماسٹر ایک بدقماش انسان تھا جسے یہ زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بیروزگاری کا دوسری بار مقابلہ درپیش

تھا۔ خورد و نوش کے مسائل پیدا ہوئے۔ اسی عرصہ میں ان کے دولڑکے یکے بعد دیگرے شدید بیماری و حالتِ لاچاری، مناسب خوراک وادویات کی عدم دستیابی کی بنا پر ہلاک ہوگئے۔ 1952ء میں جیکب آباد سے دوسری مرتبہ ہجرت کرکے عالم پریشانی و بے سروسامانی اور دو بیٹوں کی ناگہانی موت کا اندوہ نہانی لیے کراچی میں وارد ہوئے اور جیکب لائن میں ایک جھونپڑی ڈال کر سکونت اختیار کی۔ یہیں سے عوامی سیاسی زندگی کا آغاز کیا جو گوہر یکدانہ کی تکمیل کا باعث بنا۔ گرگ باراں دیدہ کی جوہر شناسی اور ان کے خفیہ اداروں کی مشاقی سائیں عزیز اللہ کے طریقہ کار اور احتیاط پسندی کے آہنی حصار کو آخری دم تک سر نہ کرسکیں۔

وہ نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ بے انتہا قوت ارادی کے مالک تھے۔ اپنے مخالفین کو نہ صرف برداشت کرتے تھے بلکہ ان کا مقابلہ عوام کی زیادہ سے زیادہ خدمت کے ذریعے کرتے تھے۔ وہ پستہ قد اور فربہ جسم کے مالک تھے۔ ابتدا میں شیروانی، علی گڑھ کٹ کا پاجامہ، لیاقت کیپ زیب تن کرتے تھے۔ لیکن جب کسانوں میں کام کرنے لگے تو سندھی ٹوپی اور اجرک استعمال کرنے لگے، آخری عمر کی دہائی میں پیٹ کے مرض میں مبتلا ہوکر علاج کی غرض سے ماسکو گئے۔ جہاں افروایشیائی تنظیموں کے اجلاسوں سے بھی خطاب کیا۔ واپسی میں افغانستان گئے، ان دنوں افغانستان میں ڈاکٹر نجیب اللہ کی حکومت تھی۔ ڈاکٹر نجیب اللہ نے انہیں اپنا مہمان بنایا اور بڑے عزت واحترام سے پیش آئے۔ 84 سال کی عمر پائی اور 21 جون 2002ء میں انتقال ہوا ان کی اہلیہ، جو خود بھی سیاسی ماحول کی پروردہ تھیں اپنے شوہر کی وفا شعار، قربانی وایثار کا پیکر، اپنے اوپر گزرنے والے واقعات اور بیتنے والے لمحات کا بڑی حوصلہ مندی اور ثابت قدمی سے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ شوہر کے سیاسی خیالات جو ان کا مقصدِ حیات تھا کے حصول کی خاطر انہیں ہر قسم کی سہولت فراہم کرتی رہیں اور شوہر کو کامیابی سے ہمکنار ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کیا۔ ساری عمر اپنے شوہر کے ساتھ محرومیوں کی آگ میں جھلتی رہیں۔ فروری 2006ء میں وصال پایا۔

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارض وطن
جو تیرے عارض بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہو گا
کتنے آنسو تیرے صحراؤں کو گلزار کریں

ڈاکٹر میر رحمان علی ہاشمی

حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتے تھے تقسیم کے بعد پاکستان آگئے اور ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کو جاری رکھا۔ پاکستان کی تاریخ ساز طلبہ تنظیم ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کے بانیوں میں سے تھے جو 1948ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے قیام میں کراچی کے دیگر تعلیمی اِداروں کے بھی سرکردہ طلبا رہنماؤں نے حصہ لیا لیکن ڈاؤ میڈیکل کالج کا یونٹ سب سے مضبوط اور طاقتور تھا۔ ڈاکٹر ہاشمی اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ ان کی نہایت متحرک اور فعال قیادت نے بہت جلد اس تنظیم کو شہرت، مقبولیت اور وسعت کے درجات عطا کیے۔ ڈاکٹر صاحب بہت اچھے مقرر اور ترقی پسند نظریہ حیات کے پُر جوش مبلغ تھے۔ ان کی یہ سوچ ان کی ساری زندگی میں ان کے عمل اور کردار پہ حاوی رہی۔ آج زندگی کے ہر شعبہ میں بلندیوں اور رفعتوں پر پہنچنے والی شخصیات جن کا تعلق طب، صحافت، ادب، قانون اور تعلیم سے ہے جو اپنی اپنی جگہ مینار نور Light House بنے ہوئے ہیں ان سب کا رشتہ DSF سے جا کر ملتا ہے۔ ڈاکٹروں کی تو ایک کہکشاں ہے جو ظلمتوں کے افلاک پر منور نظر آتی ہے۔ DSF کی تنظیم کراچی سے نکل کر سندھ کے اندرون سے ہوتی ہوئی ملک کے دیگر علاقوں میں پھیلتی گئی۔ اس کا ایک کنونشن کیٹرک ہال صدر کراچی میں منعقد ہوا جس میں ملک بھر کے وفود نے شرکت کی تھی جنھیں مشہور متھارام ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس کنونشن میں 8 جنوری 1953ء کی وہ قرارداد پاس ہوئی جس کے تحت اُس دن کراچی شہر کے تمام تعلیمی اداروں میں ہڑتال اور ایک عظیم الشان جلوس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ حکومت کے کارندے اس فیصلے سے لرزہ براندام ہو گئے اور انہوں نے اس ہڑتال کو ناکام بنانے کے لیے طالب علموں کی گرفتاریاں شروع کر دیں۔ DSF کے اہم رہنما روپوش ہو گئے اور 8 جنوری کے

پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے ایک بہترین حکمت عملی وضع کی۔ کراچی کے تمام تعلیمی اداروں میں مکمل ہڑتال ہوئی اور پورے شہر سے طالب علموں کی ٹولیاں جوق در جوق مرکزی جلوس میں شرکت کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آئی۔ رفتہ رفتہ اس قدر بڑا جلوس منظم ہوا کہ تاحدِ نگاہ پورے صدر کی اہم شاہراہوں پر انسانی سر ہی سر نظر آنے لگے جو تعلیمی اصلاحات اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے فلک شگاف نعرے لگاتے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ شہر کی پولیس اور پیرا ملٹری فورس حرکت میں آگئی اور بپھرے ہوئے نوجوانوں کو پرامن طریقوں سے منتشر کروانے کے بجائے اُن پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیا۔ جس سے نوجوان مزید طیش میں آگئے اور پولیس پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ جس کے جواب میں پولیس نے گولیاں چلانی شروع کر دیں جس سے کئی طالب علم ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے۔ سڑکیں معصوم نوجوانوں کے خون سے سرخ ہو گئیں۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک سیاہ ترین دن تھا جو حکومت کی سفاکی اور بہیمت کی بدترین مثال بن گیا۔ اس موقع پر حمایت علی شاعر نے ایک نظم کہی جس کا ایک شعر مجھے یاد ہے۔

عظیم ماں تیرا چٹان سا بیٹا زمیں میں گڑھ تو گیا
ہوئی ہے کتنوں کی عمریں دراز یہ بھی تو دیکھ

ان دنوں اے ٹی نقوی کراچی کے ایڈمنسٹریٹر تھے اور مشتاق احمد گورمانی غالباً وزیرتعلیم تھے۔ ہر دو کے استعفے کے مطالبے بلند ہوئے اور پورے ملک میں کراچی کی فائرنگ کے خلاف شدید احتجاج ہوا اس صورتحال میں مزید بگاڑ اُس وقت پیدا ہوا جب DSF پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تحریکیں بہتے ہوئے پانی کی طرح ہوتی ہیں جو اپنا راستہ خود بنا لیتی ہیں۔ DSF پر پابندی لگی تو NSF کھڑی ہوگئی جس میں نیا خون شامل ہو گیا جو مزید پُرعزم اور پُرجوش ثابت ہوا۔

ڈاکٹر ہاشمی نے ڈاؤمیڈیکل سے فارغ التحصیل ہو کر جناح ہسپتال میں ملازمت اختیار کر لی اور بلڈ بنک کے انچارج مقرر ہوئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے دکھی انسانیت کی خدمت جس دیانتداری و امانت داری سے انجام دی اُس کی ایک دنیا معترف ہے۔

پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم پر بھی ڈاکٹر ہاشمی نے ذمہ دار عہدوں پر فائز رہتے ہوئے نہایت اہم کردار ادا کیا اور PMA کو انسانی خدمت کے لیے پورے ملک میں منظم کیا اور طب کے شعبے میں رجعت پسند طاقتوں سے خوب ٹکر لی۔

جناح ہسپتال سے سبکدوش ہونے کے بعد ڈاکٹر ہاشمی سیاست میں پھر سرگرم ہو گئے انہوں نے پورے ملک کا دورہ کر کے سیاسی کارکنوں سے ملاقات کی اور ملک بھر کے تمام کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی سعی کی۔ اُن دنوں ترقی پسند کارکن کئی گروپوں میں منقسم تھے، یہ کیفیت آج بھی ہے۔ اس سلسلے میں کئی میٹنگیں ہوئیں لیکن بارآور ثابت نہ ہوسکیں۔ آخر کار ڈاکٹر ہاشمی نے کراچی کے مارکسسٹوں کو مہینے میں ایک بار PMA ہاؤس میں مدعو کرنا شروع کیا جہاں ملکی سیاسی صورتحال اور بائیں بازو کے کردار پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ یہ گفتگو کافی عرصہ تک جاری رہی اور کام ایک ہی جگہ پر ٹھہر گیا جس پر میں اور چند دوسرے کارکنوں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں اس جمود سے باہر نکل آنا چاہیے۔ مارکسزم عمل کے بغیر تلاوت کی حد تک جاری رکھنا اس کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں میں نے اپنا ایک مضمون بھی پیش کیا اور اس کی کاپیاں بھی حاضرین میں تقسیم کیں اس پر ایک کمیٹی بنائی گئی جس کو شہر میں عملی کام کا جائزہ لینے اور اپنی سفارشات پیش کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس کمیٹی کی بھی میٹنگیں ہوتی رہیں لیکن کام آگے نہیں بڑھ پایا۔

PMA کی نشستوں میں اہم مقرر اقبال احمد خان اور خود ڈاکٹر صاحب ہوا کرتے تھے۔ کارکن انہیں سُننے کے لیے ہی جمع ہو جایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کثرت سے سگریٹ نوشی کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا اور وہ اسی موذی مرض میں وفات پا گئے۔ اس طرح کراچی شہر ایک متحرک اور نظریات کے امانت دار سے محروم ہو گیا۔

زین الدین خان لودھی

پرانے طالب علم رہنما تھے۔ DSF میں رہے پھر NSF میں سرگرم رہے۔ حسن ناصر کے بااعتماد کارکنوں میں سے تھے۔ ان کی شادی ڈاکٹر شمیم سے انجام پائی تھی جو خود بھی بڑی سرگرم کارکن تھیں۔ شادی میں حسین شہید سہروردی نے شرکت کی تھی۔ بے روزگار تھے۔ بیروزگاری سے تنگ آ کر پاکستان رائٹرز گلڈ کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ انہوں نے یہ ملازمت حسن ناصر سے پوچھ کر اختیار کی تھی۔

سعید پاشا لودھی کے بھائی تھے جو معروف ٹریڈ یونین رہنما تھے۔ ان کے ساتھ ٹریڈ یونین میں بھی کام کیا۔ اور حسن ناصر سے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ بعد میں بھٹو کے سحر کا شکار ہو گئے تھے پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر بائیں بازو کے کارکنوں کی رہنمائی کی۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر شمیم زین الدین خان تو آخری وقت تک پیپلز پارٹی ہی میں رہیں۔

کامریڈ زین الدین خان ماؤ کی شخصیت اور نظریات سے متاثر ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک علیحدہ انقلابی گروپ طالب علموں اور مزدوروں کے ساتھ مل کر سیاسی سطح پر نمایاں خدمات انجام دیں، مزدوروں کے قانونی معاملات میں بلا معاوضہ پیروی کرتے تھے۔ طلبہ تحریک میں بڑھ چڑھ کر نہ صرف حصہ لیا بلکہ اُسے ترقی پسند خطوط پر استوار کیا اور ڈاکٹر رشید حسن خان جیسے رہنما پیدا کیے۔

تحریک کی ترویج و ترقی کے دوران کئی بار قید و بند سے دوچار ہوئے۔ شوگر، بلند فشار خون اور دل کے امراض میں مبتلا تھے وفات پا گئے۔ وہ نظریات داں، شعلہ بیان مقرر اور انتھک جدوجہد کے قائل تھے۔ میری ان کے ساتھ طویل رفاقت رہی، ہم حسن ناصر کی روپوشی کے عرصہ

میں اکٹھے کام کیا کرتے تھے دوپہر کو پیٹ بھرنے کے لیے چھولے کھانے صدر چلے جایا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے چھولے کھانے سے ہارس پاور بڑھتا ہے۔ اُن دنوں ایک پیالہ بھر چھولے چار آنے میں مل جاتے تھے۔ بعض اوقات ہم دونوں کے درمیان ایک ہی پیالہ ہوتا تھا شاید ہم پیالہ اور ہم نوالہ اسی کو کہتے ہیں۔ بڑے پُر خلوص اور سچے انسان تھے۔

کامریڈ رشید احمد ایڈووکیٹ

پارٹی کے قدیم اور معتبر رہنماؤں میں سے تھے۔ لکھنؤ سے تعلق تھا کامریڈ سجاد ظہیر اور پارٹی کی محبت میں ہندوستان چھوڑ کر پاکستان چلے آئے اور نواب شاہ کو اپنا مستقر اور اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے اور نامور وکیلوں میں شامل تھے۔ نواب شاہ کی تمام مزدور تنظیموں اور ہاری کمیٹیوں سے رابطہ رکھا کرتے اور اُن کے قانونی مسائل کا بلا معاوضہ مقدمہ لڑا کرتے۔ ان کا دفتر پارٹی کی تنظیم کا مرکز اور محور ہوا کرتا۔ اپنی بزرگی تجربہ اور علم سے پارٹی کی رہنمائی کرتے اور ہمیشہ حزبِ اختلاف ہی میں رہے۔ پارٹی کے فیصلوں سے اختلاف کر کے پارٹی سے علیحدہ ہو جانا یا کوئی بھی گروپ کھڑا کر دینے کو پارٹی کی بنیادی تعلیمات کے خلاف سمجھتے تھے۔ 1968ء میں سکرنڈ ہاری کانفرنس جس کی تنظیم اور تیاری سائیں عزیز اللہ نے کی تھی اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے اور اس موقعہ پر نہایت عالمانہ خطبہ صدارت پیش کیا۔ اس کانفرنس میں سندھ بھر کے ہزاروں کسانوں اور مزدروں نے شرکت کی تھی۔ مختلف تنظیموں کے علاوہ عوامی ادبی انجمن اور انجمن جمہوریت پسند خواتین کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اس کانفرس میں شہداد پور ہاری کمیٹی کے رہنما شہاب الدین ید اللہ کے فرزند جو بہت کم عمر تھے نے تقریر کر کے حاضرین سے بڑی داد وصول کی وہ شمس الدین تھے جواب بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اس کانفرنس کی ایک اہم بات یہ تھی کہ کراچی سے نوجوانوں کا ایک وفد جس کی قیادت ہادی نقوی نے کی تھی، پیدل چل کر سکرند پہنچا تھا۔ یہ لوگ جب جلسہ گاہ پہنچے تو ان کا جس والہانہ انداز سے استقبال کیا گیا وہ لوگ کبھی نہیں بھولیں گے۔ کامریڈ رشید احمد اس کانفرنس کی انتظامی کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ اُنہوں نے 85 سال کی عمر میں وفات پائی۔

کامریڈ رحمت علی کی یاد میں

کراچی کے مضافات کی ایک چھوٹی سی بستی کے آخری سرے پر واقع ایک چھوٹے سے مکان میں مدتوں سے آباد کامریڈ رحمت علی 23 دسمبر 1998ء کی شب وفات پا گئے۔ دوستوں کو ان کی وفات کا علم آپس کے رابطوں سے ہوا جب کہ ذرائع ابلاغ تک کسی کی رسائی نہ ہو سکی، جس کی بنا پر کراچی شہر کے سیاسی وسماجی حلقے ایک ایسے انسان کی موت کی خبر سے بروقت روشناس نہ ہو سکے جس نے اس شہر میں اپنی زندگی کے پچاس سال ایک ایسے نظریے کی آبیاری میں گزار دیے جس میں تمام انسانوں کو زندہ رہنے کے یکساں حقوق کی ضمانت اور استحصال سے پاک معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد کا درس دیا گیا تھا۔ کامریڈ رحمت علی کا تعلق کمیونسٹ کارکنوں کے اُس قبیلے سے تھا جو پاکستان کے وجود میں آ جانے کے بعد ہندوستان سے اس ملک میں کمیونسٹ تحریک کو منظم کرنے کے لیے آ بسے۔ اس طرح وہ پاکستان میں تحریک کے اولین کارکنوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

میری کامریڈ رحمت علی سے پہلی ملاقات ۱۹۵۲ء میں بندر روڈ پر واقع ٹریڈ یونین کے دفتر میں ہوئی۔ جہاں ہم لانڈھی کے مزدور کارکن اپنے ساتھیوں سے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ وہ پارٹی کے ٹریڈ یونین فرنٹ پر گھریلو صنعتوں کی ایک صنعت جفت سازی کے ایک بہت ہی سرگرم راہنما تھے اور جفت سازی میں کام کرنے والے کارکنوں کو منظم کرنے اور اُن میں انقلابی نظریات کی تعلیم و تربیت کے اہم ترین منصب پر فائز تھے۔ اُن دنوں پارٹی کے مزدور محاذ پر جو کامریڈ سرگرم تھے اور جنھوں نے کراچی پورٹ ٹرسٹ، کراچی میونسپل کارپوریشن، پی ڈبلیو ڈی جیسے کلیدی اداروں میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور مزدوروں کو منظم کرنے کے لیے بے

پناہ قربانیاں دیں۔ اُن میں ایک طرف نارئین داس بیچر، سوبھو گیان چندانی اور محمد زبیر مزدوروں کے مسلمہ لیڈر تسلیم کئے جاتے تھے تو دوسری طرف فیکٹریوں، ملوں اور گھریلو صنعتوں کے مزدوروں کی تنظیم میں شرف علی، اعزاز نظیر، محمد غیور، اسماعیل یوسف، غفار علی جان، محمد رمضان، محمد علی ملباری، بی ایم کُٹی، عبدالرحمٰن اور رحمت علی جیسے کل وقتی مزدور راہنماؤں کے نام پیش پیش رہے۔ جنھوں نے جبر اور استبداد کے خلاف ایسی منظم اور مؤثر تحریکیں ترتیب دیں جس کی پاداش میں متعدد بار قید و بند اور پولیس تشدد سے دوچار ہوئے نہ صرف یہ بلکہ اپنے افراد خاندان کو بھی ان تحریکوں میں اپنا مددگار بنایا اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہونے میں وہ ان کے ممد و معاون بنے۔

کامریڈ رحمت علی کا شمار پارٹی کے ایسے کارکنوں میں ہوتا تھا جنھوں نے کبھی سمجھوتہ بازی سے کام نہیں لیا اور نہ ہی ذاتی منفعت کو پیش نظر رکھا، وہ سچ بولنے اور سچایوں کا ساتھ دینے میں شمشیر برہنہ کے نام سے ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ انھوں نے پچاس سال سے بھی اوپر پارٹی سے وابستگی کو روز اول کی طرح جوش جذبہ اور ولولہ سے ہمیشہ معمور رکھا۔ سچ بولنے اور سچائیوں پر قائم رہنے ہی کی روائیتوں میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اُنھوں نے اُس وقت پارٹی کی قیادت کی انتہا پسندی اور مہم جوئی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے پارٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ بعد کو حالات نے کامریڈ رحمت علی کے موقف کی تائید کی اور انھوں نے پارٹی میں واپس آ کر دوبارہ اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

کامریڈ رحمت علی کو اس امر کا اعزاز بھی حاصل تھا کہ انہوں نے ایوب خان کے مارشل لا کے آخری ادوار میں منعقد ہونے والی سندھ کی کیمونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس کی صدارت کی جو تاریخ کے قرطاس پر ہمیشہ کے لیے رقم ہو گیا۔ یہ ان کی خدمات کا ایک اعلیٰ ترین اعتراف تھا جو تمام کارکنوں نے متفقہ طور پر بہ یک آواز ہو کر تالیوں کی گونج میں ان کے نام کی تائید کی اور اُنھیں کانگرس کی کارروائیوں کو جاری رکھنے کے لیے ایک مرکز کے طور پر تسلیم کر کے اپنے لئے فخر محسوس کیا۔

کامریڈ رحمت علی اگر چہ کہ باقاعدہ کسی درسگاہ کے فارغ التحصیل نہیں تھے لیکن وہ علم اور آگاہی کے اُس منصب پر فائز ہو چکے تھے جہاں سے فکر و عمل کے سوتے پھوٹتے ہیں وہ تنظیم سازی کا وسیع تجربہ رکھتے تھے اور اپنے نظریے کی سچائی پر کامل ایقان تھا، انھوں نے مارکسزم کو عمل کے دوران سیکھا، جانچا اور پرکھا، یہ ہی اُن کی خوبی تھی اور یہ ہی اُن کا وصف تھا۔ وہ کوئی بہت بڑے

دانشور نہیں تھے لیکن اُن کی دانشمندی میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ وہ نرم خو اور نرم گفتگو تھے۔ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں فلسفہ کے ادق اور اُلجھے ہوئے مسائل کو نہ صرف بیان کر دیا کرتے تھے بلکہ اُن کا حل بھی پیش کر دیتے تھے۔ جس سے عمل، نظریہ اور تجربہ پر ان کی گرفت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اُن کی مثال دریا کے کنارے پر استادہ اُس مینار نور کی سی تھی جو اپنی روشنی سے نہ صرف اپنی موجودگی کا اظہار کرتا تھا بلکہ اندھیری رات میں دریا کے اندر مختلف سمتوں میں بہنے والی کشتیوں کے لیے صحیح سمت کا تعین کرنے کی سبیل مہیا کرتا تھا۔ انھوں نے اپنے کام سے حد درجہ دلچسپی اپنی زندگی کی درویشی اور اپنے تجربہ کی دور اندیشی سے ایسی مثال قائم کی کہ بے شمار نوجوانوں نے اُنھیں اپنا معلم جان کر اپنے شعور کو اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر صیقل کیا۔

کامریڈ رحمت کے آباواجداد کا تعلق لکھنؤ سے تھا جو کسب معاش کی خاطر کانپور میں آباد ہوے، اُن کے والد خیرات علی نے کانپور میں جفت سازی کا پیشہ اختیار کیا۔ یہ خاندان جو دو لڑکوں اور چھ بہنوں پر مشتمل تھا بہتر ذریعہ روزگار کی خاطر ممبئی منتقل ہو گیا۔ کامریڈ رحمت اپنے والدین کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ممبئی ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تمدنی سرگرمیوں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ اس شہر میں مزدوروں کی تعداد تمام ہندوستان میں سب سے زیادہ تھی۔ جس کی وجہ سے فکری سطح میں طبقاتی شعور کا ایندھن نوجوانوں کو کندن بنا رہا تھا۔ نوجوان رحمت علی جس کی زندگی بھر کی سخت محنت سے حاصل ہونے والی قلیل آمدنی سے نہایت تنگدستی اور عسرت کے ساتھ بسر ہو رہی تھی اس تبدیلی سے خود کو کیسے بچا سکتے تھے۔ اُنھوں نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد کراچی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک تحریک کے ساتھ اپنی وابستگی برقرار رکھی۔ وہ زندگی کے آخری حصے میں فالج کا شکار ہو کر چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ بعد کو ذیابیطس کے موذی مرض نے اُن کے پیر میں خطرناک زخم پیدا کر دیا جو ہلاکت خیز تھا۔ اس زخم کے زہریلے اثرات جسم میں سرائیت کر گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے عمل جراحی سے پیر کو جسم سے علیحدہ کرنے ہی کو واحد حل جان کر اپنی تدبیر پر عمل کیا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس طرح کراچی میں ایک اور سرگرم پرجوش مستقل مزاج ٹریڈ یونین کارکن ایک چراغ کی طرح جلتا کبھی بھڑکتا کبھی ٹمٹاتا ۸۰ سال کی عمر میں پچاس سال سے کچھ اوپر اپنی روشنی سے ظلم و جبر کی اندھیری راتوں کو منور کرتا گل ہو گیا۔ اس کے پسماندگان اور سوگواران میں

جہاں ایک بیوہ، چار لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں وہاں اس کے دوستوں، ساتھیوں، عقیدت مندوں اور تعلقداروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ چراغ چراغِ آخر شب ہی ثابت ہوگا۔ سال ۱۹۹۸ء اس لحاظ سے بدترین اور اذیت ناک سمجھا جائے گا کہ اس کی ابتداء سے انتہا تک اس شہر میں ترقی پسندی و روشن خیالی کے فروغ اور ظلم واستحصال کے خلاف منظم جدوجہد کرنے والے چار نہایت باہمت، حوصلہ مند جرأت و بہادری کے پیکر اعزاز نظر، ڈاکٹر شیر افضل، ملک رحمت علی اور حمزہ واحد بشیر یکے بعد دیگرے وفات پاتے رہے اور اس شہر کو اپنے پیچھے اداس و سوگوار کر گئے۔ ان سب کا تعلق مارکسی نظریات اور اُس کی تعلیمات سے تھا۔ وہ ایک بہتر مستقبل کی خاطر معاشرے میں تبدیلی کے لیے مسلسل جدوجہد کی علامت تھے جو محنت کشوں، مزدوروں اور محروم طبقوں کی آواز بن کر پورے ملک میں اس شہر کی قائدانہ ترقی پسند سیاست کے خدوخال کو اُجاگر کرتے ہوئے اس کے حسن و جمال کو اپنے خون جگر کی سرخی سے گلنار کیا۔ جس کے باوصف ملک بھر میں اس کی توقیر کو وہ درجہ کمال عطا ہوا کہ آج تک ظلم اور جبر کے ایوانوں میں ایک بھونچال برپا ہے۔

فتح اللہ عثمانی

کچھ یادیں کچھ باتیں

آج سے تقریباً پچاس سال قبل سن 1955ء کی بات ہے۔ ادبستان۔ خیر پور کے شاہی بازار کے پیچھے ایک تنگ گلی کی دو دو دکانوں کے احاطے پر مشتمل تھا۔ یہ دوکانیں پہلے کبھی اناج کے گوداموں کے لیے استعمال ہوا کرتی تھیں۔ دوکانوں کے درمیان کی دیوار جگہ کو کشادہ کرنے کے لیے ہٹا دی گئی تھی۔ دیواریں کچی مٹی کی تھیں اور چونے کی سفیدی سے محروم تھیں۔ نیچے فرش بھی کچی مٹی ہی کا تھا جس کو دریوں سے چھپا دیا گیا تھا اور دریوں کو سفید چادروں سے۔ سفید چادریں دیواروں کی عریانی کو زیادہ نمایاں کر رہی تھیں۔ ایک کونے میں ایک تختی آویزاں تھی جس پر جلی حروف سے ادبستان خیر پور میرس تحریر تھا۔ یہ ادارہ سندھ کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا جسے حسن حمیدی اعزاز نذیر، اسحاق عباسی اور ڈاکٹر تنویر عباسی نے دیگر دوستوں کے تعاون سے قائم کیا تھا۔ اعزاز نذیر جو پہلے اعزاز الدین احمد ہوا کرتے تھے سن 1954ء میں کراچی سے اپنی سرگرمیوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے ڈاکٹر نظیر کے نام سے خیر پور میں داخل ہوئے اور یہاں سے انہوں نے ٹریڈ یونین، سیاسی پلیٹ فارم اور ادبی محاذ پر بیک وقت کام شروع کر دیا۔ ان کے پیچھے ہمیں بھی خیر پور آنا پڑا اور اپنے نام کو بھی تبدیل کر دینا پڑا، ویسے ہمارا ریکارڈ لانڈھی مل ایریا میں کچھ اچھا نہیں تھا۔ ماچس فیکٹری سے یونین سازی کی پاداش میں نکال دیے گئے تھے۔ یہاں ہم ریاض حسین کے فرضی نام سے جانے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں ہمیں ہفتہ دس دن ان کے گھر قیام کرنے کا موقع بھی ملا اور ان کے گھر سے بے تکلفانہ تعلقات قائم ہوئے۔

ہم ادبستان میں داخل ہوکر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ یہاں ایک ادبی محفل برپا ہونی تھی جس کی صدارت پروفیسر کرار حسین صاحب کو کرنی تھی۔ ہماری نگاہیں ماحول کا جائزہ لیتی ہوئی اُن افراد تک پہنچنی شروع ہوئیں جو آہستہ آہستہ اس محفل میں شرکت کرنے کی غرض سے آتے جا رہے تھے اور اپنی اپنی نشست پر براجمان ہورہے تھے۔ ان افراد میں سے کچھ نئے اور کچھ پُرانے چہرے تھے۔ بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک شخصیت بہت نمایاں تھی اپنے خدوخال اور چال ڈھال میں منفرد۔ دراز قد چھریرا بدن گندمی رنگ سر پر بال ندارد جسم پر ٹویڈ کی شیروانی جس کے تمام بٹن گلے تک بند نیچے سفید شلوار پیر میں چپل پان چباتے مسکراتے دھیمے دھیمے چلتے داخل ہوئے، یہ انداز بڑا پرکشش تھا۔

ہمارا اشتیاق بڑھا۔ گویا یہاں بھی کوئی دکنی حیدرآبادی اپنی پوری روایتی وضع قطع کے ساتھ موجود ہے۔ ہم نے سرگوشی میں پوچھا یہ کون صاحب ہیں بھئی؟ ارے تم نہیں جانتے یہ فتح اللہ عثمانی ہیں۔ نام تو سن رکھا تھا دیکھ پہلی دفعہ رہا تھا اور دیر تک دیکھتا رہا اپنے ہم وطن کو یہاں اس دور افتادہ علاقے میں یوں اپنی ثقافت کی جیتی جاگتی تصویر بنے دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی اور بہت مسرت بھی، ابھی ہم دیکھ ہی رہے تھے کہ ان حضرت نے گفتگو شروع کی اور ہمیں ورطہ حیرت میں غوطہ زن کر دیا۔ سندھی زبان، وہی لہجہ وہی انداز بیان اور پھر جب اردو بولنے لگے تو دکنی چاشنی، بڑی دلچسپ شخصیت ہے ہم ان کے قریب ہو گئے چپکے سے اپنا تعارف کروایا کہنے لگے اچھا تو آپ ''کالورام'' کے بھائی ہیں۔ عثمانی صاحب ڈاکٹر اعزاز نذیر کو پیار سے اور کچھ پردہ داری کی احتیاط سے ان کی روپوشی کے دوران اسی نام سے پکارتے تھے۔ دفعتہً اعلان ہوا کہ پروفیسر کرار حسین کا قیام کراچی میں ایک دن اور بڑھ گیا ہے۔ واضح ہو کہ پروفیسر صاحب اُن دنوں خیرپور ہی میں مقیم تھے۔ اور یہاں کے مقامی کالج میں پرنسپل تھے اب نشست تو ملتوی ہوگئی لیکن محفل ہنوز برقرار تھی ایک غیر رسمی گفتگو کا سلسلہ جو پہلے سے شروع ہو چکا تھا آگے بڑھتا گیا۔ حضرت عثمانی کو بولنے اور ہمیں سننے کا موقع ملتا گیا پھر اُن کے خیالات کے اظہار کا ایک دریا تھا کہ بہتا گیا، پورے زور شور سے پوری روانی سے فکر کا اجلا پانی اپنے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے لوگوں کے شعور کو سیراب کرتا ذہنوں میں تلاطم پیدا کرتا اُس کی آبیاری کرتا۔ خطابت کا یہ مزاج جس میں اردو اور سندھی کا امتزاج ایک نیا لہجہ قائم کرتے ہوئے عجیب سماں باندھ دیا تھا اُن کی گفتگو اس محفل میں، دیر تک

یونہی جاری رہی۔

عثمانی صاحب سے ہماری دوسری ملاقات 1956ء میں سندھ ہاری کانفرنس کے موقع پر سرہاری اسٹیشن پر ہوئی۔ سرہاری کانفرنس سندھ بھر کے تمام ترقی پسند مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، سیاسی کارکنوں، دانشوروں، وکیلوں اور صحافیوں کا ایک عظیم اجتماع تھا۔ قاضی فیض محمد کے گاؤں اور انہی کی رہائش گاہ پر سرہاری اسٹیشن پر کچھ دیر کے فرق سے دو ٹرینیں دو مخالف سمتوں سے آ کر رکیں ایک کراچی کی جانب سے اور دوسری سکھر اور خیر پور کی طرف سے، کراچی کی ٹرین سے ایک بہت بڑا قافلہ کامریڈ حسن ناصر کی سربراہی میں پہنچا تھا۔ جس میں اُن کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی کے کامریڈ امام علی نازش، لانڈھی ورکرز کے کامریڈ زبیر، منگو پیر کے علی جان، بیڑی ورکرز کے محمد علی، مالباری شو ورکرز کے رحمت علی اور سمیع داد طالب علم رہنما ڈاکٹر سرور، ڈاکٹر شیر افضل، ڈاکٹر منظور احمد، معراج محمد خان، جوہر حسین ٹرانسپورٹ ورکرز کے عبدالسلام شاعروں اور ادیبوں کی طرف سے عبدالرؤف عروج تحسین سروری قمر ساحری اور اُن کے ساتھ درجنوں کارکن اپنے بازوؤں پر سرخ پٹیاں باندھے ہاتھوں میں سرخ پرچم اُٹھائے ٹرین کے ڈبوں سے اُمنڈ پڑے۔ دوسری طرف سے آنے والی ٹرین میں ڈاکٹر اعزاز نذیر، رکن الدین قاسمی فتح اللہ عثمانی اپنے بے شمار رفیقوں کے ساتھ بڑی تعداد میں وارد ہوئے۔ عثمانی صاحب کا وہی انداز، وہی دل آویز مسکراہٹ، وہی شیروانی۔ سرہاری اسٹیشن پر سب کا استقبال کرنے کے لیے مشہور کمیونسٹ رہنما کامریڈ عزیز سلام بخاری اور سائیں عزیز اللہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سرخ بینر لیے اور سرخ پرچم سنبھالے موجود تھے۔ ہم سب انہی کی رہنمائی میں پیدل ایک جلوس کی شکل میں جلسہ گاہ پہنچے، بخاری صاحب نے ہمیں راستے میں بتایا کہ انہوں نے ایک کمرہ ہم تمام کھٹا کھانے والوں کے لیے مختص کر دیا ہے اور خود بھی اِن کے ساتھ اپنے دیرینہ مراسم کی بنا پر اُسی کمرے میں قیام کریں گے۔ اب ہمارے کمرے میں اس اعتبار سے حسن ناصر، اعزاز نذیر، فتح اللہ عثمانی، ڈاکٹر منظور احمد، ٹرانسپورٹ کے عبدالسلام، غوث علی اور عزیز سلام بخاری ساتھ ہو گئے۔ تین دن کی اس کانفرنس میں بڑی گہما گہمی اور ہماہمی رہی یہ ابتدا تھی پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی کے قیام کی۔

یہاں ایک اور اہم واقعہ رقم کرنا ضروری ہے کہ ایک دن صبح ناشتہ پر ہم سب اکٹھے ہوئے تو ایک صاحب جو صورت شکل سے کوئی مولوی معلوم ہوتے تھے، شامل طعام ہو گئے اُن کی

اس بے جا مداخلت اور بے تکلفی پر ہمیں غصہ آ رہا تھا اور گھن بھی آ رہی تھی۔ وہ کھسکتے کھسکتے ہم لوگوں کے درمیان فٹ ہو گئے۔ انہوں نے سر پر جناح کیپ اوڑھی ہوئی تھی، لمبی ڈاڑھی، کندھے پر رومال ڈالے یوں شریک ناشتہ ہوئے کہ ہمیں اُن کی اس جسارت پر غصہ آ گیا وہ بڑی عجلت میں ناشتہ کر کے چلے گئے۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ یہ صورت کچھ جانی پہچانی سی ہے اگر چہ شکل بدلی بدلی سی تھی ہم نے بخاری صاحب سے کان میں کہا کہ ایسا سُنا جا رہا ہے کہ کامریڈ شرف علی، بھی یہاں آئے ہوئے ہیں وہ ان دنوں روپوش تھے۔ بخاری صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا اور کہنے لگے بھائی یہ ہی تو تھے شرف علی میں تیزی سے باہر نکلا مگر وہ حضرت یہ جا وہ جا غائب ہو گئے۔ عثمانی صاحب کو بھی کامریڈ شرف علی سے جواب مولانا کے نام سے جانے جاتے تھے یوں ملاقات نہ کر سکنے کا بہت ملال رہا۔ ظاہر ہے کسی روپوش کامریڈ سے تو اسی طرح ملاقات ہو سکتی تھی۔

سرہاری کانفرنس میں عثمانی صاحب کو کئی بار اپنا نکتہ نظر بیان کرنے کا موقع ملا۔ اس طرح انہیں مزید جاننے سمجھنے اور اُن کے قریب آنے کا موقع ملا۔ بعد کو اُن کے ساتھ محبت کے ایسے رشتے قائم ہوئے کہ وہ اور ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہو گئے۔

اگر چہ کہ وہ عمر میں ہم سے بہت بڑے تھے لیکن اپنی بزرگی کو کبھی ہم پر مسلط نہیں کیا وہ ہمارے اختلاف کو کبھی ہنس کر اور کبھی ہمیں سمجھانے کے انداز میں لیا کرتے۔

عثمانی صاحب سے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ 1961ء میں اُس وقت روز افزوں رہا جب ہم کراچی جیل سے شدید جسمانی اور ذہنی اذیتوں کے بعد بیماری کی حالت میں رہا ہوئے اور سیدھے سکھر پہنچے۔

یہاں ہمارا قیام کافی عرصہ تک سید مظہر جمیل، حسن حمیدی اور عثمانی صاحب کے گھر رہا۔ یہ وہ دور تھا جب لوگ ہم سے ملنے اور ملاقات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ہمارا قصور یہ تھا کہ ہم حسن ناصر کے ساتھ کام کرتے ہوئے گرفتار ہوئے تھے جو اس ملک کے محنت کشوں، نادار طبقوں کو بہتر دنیا دینے کا عزم رکھتا تھا۔

صوبہ سندھ میں کراچی کے بعد سکھر شہر کو یہ اہمیت حاصل رہی ہے کہ یہاں ایک ہی عہد میں کئی نابغہ روزگار شخصیات جمع ہوئی تھیں جن میں کئی نامور ادیب، شاعر، دانشور ماہر تعلیم، سیاسی اور ٹریڈ یونین رہنما اپنے اپنے دائرے میں سرگرم عمل تھے۔ ان شخصیات میں چند ایک کے نام اس

طرح ہیں شیخ ایاز، حسن حمیدی، رشید بھٹی، پروفیسر آفاق صدیقی خالد علیگ، پروفیسر منظر ایوبی، مظہر جمیل، شوکت عابدی، نگہت بریلوی، شمس الدین شاہ، رکن الدین قاسمی، اعزاز نذیر، ابنِ ایوب، مولا بخش خاصخیلی، شیام کمار، نبی بخش کھوسو، ممتاز مہر اور فتح اللہ عثمانی۔

ان شخصیات میں بہت سے حضرات وہ ہیں جن کی جنم بھومی سندھ کی سرزمین ہی کہلائی اور چند ایک وہ ہیں جو ہجرت کر کے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے سندھ میں وارد ہوئے۔

فتح اللہ عثمانی کو ہجرت کر کے سکھر میں قیام پذیر ہونے والے نئے سندھیوں میں ایک خصوصیت یہ حاصل تھی کہ انہوں نے یہاں کے قیام کے دوران سندھی زبان میں نہ صرف بول چال اختیار کی بلکہ اس زبان میں ایسی مہارت پیدا کی کہ اُن پر پرانے سندھیوں کو بھی رشک آتا تھا۔ وہ نہایت روانی کے ساتھ سندھی زبان کے لہجے کی نزاکتوں کو ادا کرتے ہوئے ایسی فصیح و بلیغ زبان بولا کرتے تھے کہ سننے والوں کو اس زبان کی ثروت، اس کی مٹھاس اور صوتی مخرج کی باریکیوں کا اندازہ بہ حسن و خوبی ہو جایا کرتا تھا۔ فتح اللہ عثمانی کی یہ خصوصیت اُنہیں اپنے تمام معاصرین میں ایک ممتاز مقام پر فائز کرتی ہے۔ وہ ایک پر جوش مقرر تھے اور سندھی زبان میں ان کی تقریر نہایت دل پذیر ہوا کرتی تھی۔ تقریر کے ساتھ ساتھ وہ تحریر پر بھی قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ سیاسی تجزیہ نگاری وہ ف۔ الف عثمانی کے نام سے کرتے تھے۔ اردو، انگریزی اور سندھی ادب کا اُن کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ کتابوں کو پڑھنے اور جمع کرنے کے بے حد شوقین تھے اُن کے گھر میں کتابوں کا انبار لگا ہوتا تھا۔ ایک بہت بڑی لائبریری گھر میں موجود تھی۔ کتابیں وہ کسی کو گھر لے جانے نہیں دیا کرتے تھے بلکہ ہر پڑھنے والے کے لیے اپنے گھر کا دیوان خانہ وا کر دیا کرتے تھے ساتھ ہی ساتھ پڑھنے والے کی چائے سے بار بار تواضع کیا کرتے۔ اکثر کھانے کے وقت کھانا بھی فراہم کر دیا کرتے تھے۔ میں اکثر کتابیں پڑھنے کے لیے کھانے کے وقت پہنچ جایا کرتا تھا۔ میں اُن کے ایسے دوستوں میں سے تھا۔ جو اُن تمام لوازمات سے بہرہ مند ہونے کے علاوہ اُن سے مفت کی سگریٹیں بھی ہتھیا لیا کرتا تھا وہ اکثر پہلی مرتبہ دوستوں کو سگریٹ نہایت خوشدلی خاطر داری اور مہمان نوازی کے پورے سلیقے کے ساتھ پیش کرتے لیکن دوسری مرتبہ سگریٹ کا پیکٹ جھپٹ کر جیب میں رکھ لیا کرتے تھے۔

اِن کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع اور بڑا دلچسپ تھا۔ وہ ہیمنگ وے کی طرح شہر کے

تمام مختلف الخیال افراد سے یارانہ رکھتے اور اُن سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے اور اُن کے تبصروں پر قہقہہ بلند کیا کرتے اور بہت لطف اندوز ہوا کرتے۔ گلی کے پان فروش سے لے کر تانگے کے کوچوان اور ہڈی و جوڑ کے جراح اور پہلوان تک ان کی محفل میں شریک رہتے۔ نشست و برخواست کا یہ عوامی انداز بقول ان کے انہیں انسانوں کے قریب رہنے اور اُن کے مسائل کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا تھا۔ سکھر میں اُن کے واقف کاروں کا ایک ابنوہ کثیر تھا جو قدم قدم پر انہیں سلام کرتا یا ان سے سلام لیتا۔

ماہ رمضان کے وہ پورے روزے رکھا کرتے اور افطار بہت خشوع خضوع سے ہوتی۔ عثمانی صاحب نظریاتی حوالے سے مارکسسٹ تھے اور سوشلزم کو ملک کی معاشی اور معاشرتی ابتری کو ختم کرنے کا واحد حل سمجھتے تھے۔ وہ انسانی معاشرے کی اعلیٰ ترین قدروں کے خود بھی سختی سے پابند تھے اور دوسروں کو اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔ وہ کسی بھی سماجی ناانصافی کو نہ صرف پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فرضِ اولیں سمجھا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہ صوبہ سندھ میں ہونے والی سیاسی سرگرمیوں میں شامل رہے بلکہ اُن میں قائدانہ کردار ادا کرتے رہے۔

مزاج کے اعتبار سے نہایت حلیم الطبع واقع ہوئے تھے، انہیں کبھی غصہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ ہر وقت مسکرایا کرتے تھے۔ انہیں ان کی یہ مسکراہٹ گوتم بدھ سے ایک خاص عقیدت کی وجہ سے غالباً منتقل ہوئی تھی، ان کی مسکراہٹ میں وہی حلاوت تھی۔ گوتم بدھ پر اُن کی لائبریری میں بعض نہایت نادر کتابیں موجود تھیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے سکھر میں سیاسی سیل کے ممبر تھے۔ جس کا میں سکریٹری تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو وہ ایک ذہین سیاستدان سمجھتے اور اس کو پسند کرتے تھے۔ دکنی رنگ اُتر چکا تھا اُس کی جگہ سندھی ٹوپی اور اجرک اوڑھا کرتے تھے۔ ان کی موت کا ذکر نہیں کروں گا وہ ایک بھرپور زندگی گزار کر امر ہو گئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی اور جنید بغدادی سے بھی اُن کی عقیدت تھی۔ اُن کے دونوں بیٹوں کے نام ان ہی شخصیت سے مستعار ہوئے۔ اُن کا تعلق اورنگ آباد دکن سے تھا۔ خود کو مرہٹہ ہونے پر فخر کرتے تھے۔ تاریخ کا فکر کا خطابت کا وہ دریا ادبستان کی محفلوں کی تنگنائیوں، سرہاری کی کسان کانفرنس کی گھاٹیوں۔ خیرپور سکھ اور روہڑی کی مزدور انجمنوں کے وسیع میدانوں میں اپنی روانی سے طلاطم برپا کرتا۔ 2006ء میں کتاب کی شکل میں ''نربدا سے مہران تک'' کے نام سے پیش ہوا۔

رکن الدین قاسمی

سکھر سندھ کے قدیم باشندے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے اور پرانے سکھر میں ایک وسیع و عریض کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے بعد کو کانگریس میں آ گئے۔ تقسیم کے بعد آزاد پاکستان پارٹی پھر پاکستان نیشنل پارٹی اور اس کے بعد نیشنل عوامی پارٹی میں گئے پھر کمیونسٹ پارٹی میں آ گئے۔ میری اُن سے پہلی ملاقات سرہاری کانفرنس کے لیے جمع ہونے والے کارکنوں کے درمیان سکھر سے آنے والے وفد میں 1956ء کو سرہاری اسٹیشن پر ہوئی جہاں ہم سب کا استقبال کرنے کے لیے کامریڈ عزیز سلام بخاری اپنے کارکنوں کے ہمراہ سرخ پرچموں اور سرخ بینروں کے ساتھ موجود تھے۔ درمیانے قد کے مضبوط جسم اور چوڑے چہرے والے رکن الدین قاسمی ہنس ہنس کر بات کرنے کے عادی تھے کبھی کبھار ایک آدھ قہقہہ بھی بلند کر دیتے، یہ اِن کی ادا تھی جو ہمیشہ قائم رہی۔ کانفرنس میں انہیں تقریر کرتے ہوئے بھی سُنا۔ دوسری بار ملاقاتوں کا سلسلہ اُس وقت قائم ہوا جب ہم جیل سے رہا ہو کر سکھر پہنچے تھے اور سید مظہر جمیل کے پاس مقیم تھے۔ اس وقت ان کا دفتر اور رہائش مظہر صاحب کے گھر کے عین سامنے تھا جہاں وہ اپنے دیگر موکلوں کے علاوہ مزدور کارکنوں کے مقدمات بھی لیا کرتے اور بغیر معاوضہ لڑا کرتے۔ سکھر میں میرے قیام کے دوران میں نے پارٹی کی ہدایت پر سکھر میں سیاسی سرگرمیوں کو مربوط کرنے، روبہ عمل لانے اور انہیں مانیٹر کرنے کے لیے ایک گروپ ترتیب دیا جس میں فتح اللہ عثمانی، حسن حمیدی، شعور صدیقی اور رکن الدین قاسمی شامل تھے، میں اس کا سیکرٹری تھا۔ پہلی میٹنگ میں قاسمی صاحب نے کہا کہ دیکھیں ہمیں کوئی خفیہ بات نہ بتائیں ہمارے ایک ''چمٹ'' پڑے گا تو ہم سب بتا دیں گے۔ میں نے کہا کہ خفیہ بات یہ ہے کہ

آپ ایک خفیہ تنظیم کی سیاسی کمیٹی کے خفیہ رکن ہیں اس پر سب قہقہہ لگانے لگے تو قاسمی صاحب نے کہا نہیں اتنا تو میں پچا لوں گا۔

یہ گروپ سرعت کے ساتھ کام انجام دے رہا تھا کہ 1962ء کو کراچی میں میرے والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے مجھے کراچی واپس ہو جانا پڑا۔ اس گروپ کے ارکان بعد کو اپنی ذاتی حیثیت سے سرگرم رہے۔

رکن الدین قاسمی پر فالج کا حملہ ہو گیا وہ کراچی منتقل کیے گئے اور بروقت طبی امداد مل جانے کی وجہ سے صحت یاب ہو گئے۔

میری اِن سے آخری ملاقات 2007ء میں سکھر ہی میں ہوئی، یہ فتح اللہ عثمانی کی کتاب کی تعارفی تقریب تھی ۔اس کی صدارت ایک مجلس کر رہی تھی جس میں کامریڈ سوبھو گیانچندانی، رکن الدین قاسمی، سید مظہر جمیل اور مسلم شمیم شامل تھے مجھے کراچی سے مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے اس موقع پر ایک مضمون پڑھا جس میں فتح اللہ عثمانی کی زندگی کے اہم واقعات پیش کیے گئے تھے۔ رکن الدین قاسمی نے تقریر میں فتح اللہ عثمانی کے ساتھ اپنی طویل رفاقت کا ذکر کیا۔ قاسمی صاحب جب مجھ سے ملے تو اُسی انداز میں ہنس کر اور بلند قہقہہ لگا کر ملے جس سے پہلی ملاقات کی یاد تازہ ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ وہ وفات پا گئے ۔ انہوں نے دو شادیاں کیں جس میں سے ایک لو میرج تھی جس کے لیے انہیں بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ خاندان سے باہر کی شادی تھی ۔ جو سندھی رسم و رواج کے خلاف تھی مگر قاسمی صاحب نے ساری زندگی اس کو نبھایا اور خوش و خرم زندگی بسر کی۔

کامریڈ محمد زبیر

پرانے مزدور رہنما تھے۔ ہندوستان ہی سے ٹریڈ یونین میں بڑی قد آور شخصیات کے زیر اثر کام کیا، کامریڈ وہاب کانپوری کے شاگردوں میں سے تھے۔ کراچی آ کر ٹریڈ یونین آفس کی ہدایت پر PWD کے مزدوروں کی تنظیم کی۔ PWD کے ختم ہو جانے کے بعد یہ گودی کے مزدوروں میں کام کرنے لگے۔

بعد میں لانڈھی انڈسٹریل ایریا کا رخ کیا۔ وہیں معین آباد میں ایک جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ لانڈھی میں عنایت اللہ خان ایک پختون تھے بہت مقبول تھے لیکن انہیں ٹریڈ یونین کے نشیب و فراز کا کوئی علم نہیں تھا۔ سیاسی سوجھ بوجھ بھی واجبی تھی۔ کامریڈ زبیر نے انہیں اپنے ساتھ رکھ کر اُن کی بڑی اچھی تربیت کی، بعد کو وہ ایک تجربہ کار مزدور لیڈر بن گئے۔ ان کی تربیت میں شامل حبیب بغدادی، رزاق میکش اور حاجی عدیل کافی اُبھر کر سامنے آئے۔ کامریڈ زبیر کو کئی بار پابند سلاسل کیا گیا۔ غنڈوں کے ذریعہ کافی ڈرایا دھمکایا گیا۔ مل مالکان ان کے دشمن بن گئے تھے اور انہیں اغوا کرنے اور مروا دینے کے منصوبے بنانے لگے۔ لیکن کامریڈ ان حرکتوں سے بڑی دلیری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ وہ ہر وقت مزدوروں کے جھرمٹ میں رہتے اور یہ ہی اُن کی طاقت بھی تھی۔ اعزاز نذیر کو لانڈھی بدر کرنے کے بعد حکام کا سارا زور کامریڈ زبیر کو راستے سے ہٹا دینے پر لگا ہوا تھا۔ ایوب خان کے مارشل لا میں جب حسن ناصر روپوش ہوئے تو کامریڈ زبیر کو پولیس ہیڈ کوارٹر بلایا جانے لگا اور طرح طرح سے تنگ کیا جانے لگا۔ کامریڈ کہتے تھے میں جدی پشتی مزدور ہوں ہمیشہ محنت مزدوری کی ہے اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے لڑتا رہا ہوں میں اپنے اس منصب سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اگر مجھ سے مل مالکان نالاں ہیں تو آپ لوگ

مجھے گرفتار کر لیں، میں جیل میں رہوں گا واپس آ کر پھر یہی کروں گا۔ کامریڈ زبیر کی دلیری اور بہادری کا ذکر کامریڈ انیس ہاشمی نے اپنی کتاب ''دیوانے لوگ'' میں بھی کیا ہے۔

وہ موٹے درمیانہ قد کے اور مضبوط جسم کے مالک تھے رنگ گندمی تھا۔ گفتگو کرتے تو معمولی ہکلاہٹ ظاہر ہوتی۔ آخری وقت تک مجرد رہے۔ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

سچ ہے کہ ایسے ''دیوانے لوگ'' جو فرزانوں کو شرمسار کر دیں بہت کم دیکھے گئے۔

اقبال احمد خان

حیدر آباد دکن سے تعلق تھا۔ طالب علمی کے ابتدائی دنوں میں ترقی پسند تنظیموں سے وابستہ ہو گئے تھے۔ کراچی آ کر حیدر آباد کالونی میں سید احمد صاحب کے مکان میں جہاں اعزاز نذیر اور عزیز سلام بخاری رہائش پذیر تھے رہنے لگے اور ان کی سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ جب دکن سے آئے تھے تو اپنے سوٹ کیس میں کئی جوڑے کوٹ پتلون اور شیروانیاں ساتھ لے آئے تھے جو بیروزگار نوجوانوں میں تقسیم ہو گئے۔ اپنے لیے ایک کالی شیروانی رکھ لی جو عرصہ دراز تک زیب تن کرتے رہے۔ اپنے خیالات اور نظریات کا برملا اظہار کرتے۔ ابتدا ہی سے کہا کرتے کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں گا اور یہ جملہ وہ ابتدا کے دنوں میں اصرار کے ساتھ کہا کرتے، لطف کی بات یہ ہے کہ وہ کبھی گرفتار نہیں کیے گئے۔ اسلامیہ کالج سے سیاسیات اور تاریخ کے مضامین پڑھے اور ان میں ایسی مہارت پیدا کی کہ لوگ انہیں سننے کے لیے بیتاب رہتے۔ شروع میں AGPR میں ملازم ہو گئے، اس کو چھوڑ کر انکم ٹیکس میں چلے گئے، یہاں بھی زیادہ عرصہ نہ رہ سکے۔ قانون پاس کر کے وکالت شروع کی اور وحید صدیقی اور علاؤ الدین عباسی کے ساتھ کام کرنے لگے، وکالت کے پیشے میں جن باتوں کی ضرورت تھی وہ ان میں نہیں تھی۔ اپنا زیادہ تر وقت لوگوں کے درمیان رہ کر گفتگو کرتے، بڑی روانی کے ساتھ بات کرتے اور حالات کا تجزیہ کرتے، بڑی مسحور کن گفتگو کرتے اور گھنٹوں بولا کرتے۔ اب ایسا ہونے لگا تھا کہ سُننے والے ان کے منتظر ہوتے اور وہ اُن کے منتظر ہر جلسے میں اور ہر اجتماع میں ان کی تقریر ضرور ہوتی جو حاضرین کے خون کو گرما دیتی اور ایک نیا زاویہ نگاہ سامنے آتا۔

عبداللہ ہارون کالج میں ڈاکٹر حسان انہیں اپنے ساتھ لے گئے جو وائس پرنسپل تھے اور

فیض صاحب اس کے پرنسپل تھے۔ انہیں سیاسیات اور تاریخ کے مضامین کا لیکچرر بنا دیا گیا یہاں پہنچ کر انہوں نے اطمینان کے دن گزارے۔ اب معمول یہ تھا کہ کالج کے بعد وہ فارن افیئرز کی لائبریری میں بیٹھا کرتے، وہاں شام کے 6 بجے تک سارے اخبار پڑھ لیتے کتابوں کا مطالعہ کرتے اور پھر پیدل چل کر صدر میں جہاندار ریسٹورنٹ پہنچتے جہاں ان کے شیدائی ان کا انتظار کرتے وہ رات کے 12 بجے تک وہاں رہتے یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ اکثر اتوار کو ہم لوگ انہیں ڈاکٹر منظور کے گھر ڈرگ روڈ لے کر جاتے جہاں ان کی عالمانہ گفتگو اور فاضلانہ تجزیوں سے مستفید ہوتے۔ دوست احباب انہیں علامہ کہنے لگے تھے جو نہایت موزوں لاحقہ تھا۔

زندگی بہت لاپروائی اور بے اعتدالی سے بسر کی، بے تحاشہ سگریٹ پیتے۔ ہر ماہ ڈاکٹر رحمان ہاشمی PMA ہاؤس میں ایک اجتماع منعقد کرتے جس میں بڑی تعداد میں دوست احباب شرکت کرتے تھے۔ اس اجتماع میں ''علامہ'' آخر میں اپنی تقریر کرتے جو پوری نشست کا حاصل ہوتی ان کو سُن کر اپنے علم میں معتد بہ اضافہ محسوس ہوتا۔

ناصر ان کے سلسلے میں کہا کرتے یہ عملی طور پر کچھ کر نہیں سکتے، جو کام وہ کر رہے ہیں وہ کافی ہے اس لیے انہیں ''بک اپ'' کر کے رکھیں، چھوڑنا بھی نہیں ہے۔ میں مہینے میں ایک بار ان کے پاس جا کر PF وصول کرتا جو وہ پابندی سے ادا کرتے۔ مجھے دیکھ کر پوچھ لیا کرتے راستے میں دیکھ بھال کر کے آئے ہو نا؟ آخری دنوں میں پھیپھڑوں کے مہلک مرض میں مبتلا ہوئے لیاقت ہسپتال میں آخری سانس لی۔ اس طرح نوجوان ترقی پسنداں کی رہبری اور رہنمائی سے محروم ہو گئے۔ بلا شبہ ان کی موت بہت بڑا نقصان ہے جسے تحریک کو برداشت کرنا پڑا۔

کامریڈ عبدالسلام

دکن سے ہجرت کر کے تلاش روزگار کے سلسلے میں لانڈھی کے مرغی خانے میں جھونپڑی ڈال کر رہائش اختیار کرنے اور ماچس فیکٹری میں سات آنے روز کی اُجرت پر کام کرنے والے نوجوانوں میں عبدالسلام بھی شامل تھے۔ دراز قد، کھلی ہوئی رنگت۔ ابتدا میں مزدوروں کے جلسوں میں انقلابی نظمیں اور ترانے گایا کرتے تھے۔ آواز بہت اچھی پائی تھی اور خوش الحانی مزید کشش کا باعث ہو جاتی۔ کوئی جلسہ ان کے نغموں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ نعرے بازی بھی یہ خوب کرتے تھے پھر تقریر بھی کرنا شروع کیا۔ ان کی تقریروں میں عوامی جملے اور محاورے بہت لطف دیتے جن میں طنز کے تیر ونشتر پنہاں ہوتے، مجمع قہقہے لگاتا لیکن ساتھ ہی سوچنے اور غور کرنے کی طرف راغب ہوتا۔

ماچس فیکٹری دیوالیہ ہوگئی تو سینکڑوں مزدور بے روزگار ہو گئے جن میں عبدالسلام بھی شامل تھے۔ انہوں نے شہر کا رُخ کیا اور کراچی جیل کے پیچھے جھونپڑی ڈال کر رہنے لگے۔ پیر کالونی کے بس سٹاپ پر ابتدا میں بسوں کی ٹائم کیپری کا کام کیا۔ لیکن ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں کی دھینگا مشتی اور زور آوری کی وجہ سے اس کام کو ترک کرنا پڑا۔ خود کنڈیکٹر بن گئے اور ٹرانسپورٹ کے ورکرز کی تنظیم سازی کا بیڑا اٹھایا۔ اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں کی آپس میں مقابلہ بازی، تیز رفتاری اور بس میں زیادہ مسافر بھرنے کے عمل نے ان کے اتحاد کو قائم ہونے سے روکے ہوئے تھا، دوسری طرف یہ لوگ عوام کے بھی غیض وغضب کا شکار رہتے تھے۔ انہوں نے آخر کار منگھو پیر روڈ کے انڈسٹریل ایریا کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا۔ سمیز فیکٹری میں غیر ہنر مند مزدور کی حیثیت سے روزانہ اُجرات پر

ملازم ہوگئے۔ یہاں پہلے سے مزدوروں کی یونین موجود تھی۔ جو دراصل انتظامیہ کی پروردہ تھی اس کے رہنما عیش وآرام سے گزر بسر کرتے جبکہ مزدوروں کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ کامریڈ عبدالسلام نے اس یونین میں شمولیت اختیار کر لی اور آہستہ آہستہ یونین کی مالکان کے ساتھ گٹھ جوڑ کو بے نقاب کرنے لگے۔ انہوں نے یونین میں ہم خیال اور ایماندار کارکنوں کو اپنے اعتماد میں لیا اور یونین کے انتخابات کا مطالبہ کر دیا۔ راستے میں بڑی رکاوٹیں کھڑی کی گئیں، انہیں دھمکیاں دی گئیں لیکن یہ اپنے مطالبے پر پوری شدت سے قائم رہے۔ آخر کار انتخابات ہوئے تو عبدالسلام بڑی اکثریت سے جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے اور انہوں نے مزدوروں کے کئی دیرینہ مطالبات کو منوالیا جس سے ان کی عزت اور مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ انھیں بیوی بچوں کی گھر بار کی کوئی فکر نہیں تھی۔ 12 سے 14 گھنٹے یہ یونین آفس میں موجود رہتے۔ انتظامیہ نے انہیں خریدنے کی بہت کوشش کی۔ کئی مراعات کی پیشکش کی گئی لیکن یہ اُن سب کو ٹھکراتے رہے۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض ہو گئے لیکن اپنے کام میں کسی قسم کی کمی آنے نہیں دی۔ ان کی قربانیوں کو اور یونین سے اِن کی لگن اور دلچسپی نے انہی سیمنز کی یونین کا طاقتور ترین رہنما بنا دیا اور انہیں یونین کا تاحیات سیکرٹری کے اعلیٰ ترین منصب سے سرفراز کیا گیا۔ جس پر وہ عرصہ دراز تک فائز رہے۔ بیماری کی شدت آخر جان لیوا ثابت ہوئی۔ ان کے جنازے میں منگھوپیر کے سینکڑوں اشک بار مزدوروں نے شرکت کی۔

کامریڈ عبدالسلام NAP کے جلسوں اور مظاہروں میں بھی پابندی سے شرکت کرتے اور ایسے موقعوں پر اپنی ڈیوٹی سے ناغہ کر کے اپنی روزانہ اُجرت کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔ وہ مزدوروں میں سیاسی شعور کو بیدار کرنے کا کام بھی انجام دیا کرتے تھے۔ ان کی موت سے ٹریڈ یونین میں تجربہ کار ایماندار اور منجھے ہوئے کارکن کی کمی واقع ہوگئی۔ وہ مزدوروں کے دوست، رہبر اور نظریات کے اُستاد بھی تھے اور سیدھے سادھے جملوں میں دقیق مسائل بیان کر دیا کرتے تھے۔

چچا علی جان

پہلی بار حسن ناصر خود مجھے ان کے پاس لے کر گئے۔ وہ منگھو پیر کی ایک مزدور بستی میں رہائش پذیر تھے۔ موٹے اور پستہ قد اور گول چہرے کے مالک تھے۔ بنگال سے تعلق تھا، جنم جنم کے مزدور پڑھے لکھے بالکل نہیں تھے لیکن ایک باعلم آدمی کی طرح مزدوروں کے مسائل اور ملک کی عمومی سیاست کا ادراک رکھتے تھے۔ مزدوران کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کسی مل میں ملازم تھے لیکن کسی میں اُن سے کوئی کام لینے کی ہمت نہیں تھی۔ دن بھر مختلف کارخانوں کا چکر لگا کر آیا کرتے تھے۔ اور ہر یونین کی بلکہ ہر مزدور کی خبر رکھتے تھے۔ انہوں نے باشعور مزدوروں کا ایک حلقہ بنا رکھا تھا جس میں مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔

انہوں نے ایک مرتبہ حسن ناصر سے میری شکایت کر دی کہ اس مڈل کلاسی (وہ ہر غیر مزدور کو مڈل کلاسی کہا کرتے تھے) کا دماغ درست کر دو یہ میرے پاس آتا ہے تو دری پر نہیں بیٹھتا۔ اسٹول پر بیٹھتا ہے اور بیٹھنے سے پہلے اس کو صاف کرتا ہے۔ ناصر ہنسے اور کہا دیکھیں کامریڈ پارٹی کا کوئی کارکن مڈل کلاس کا نہیں رہتا جب وہ پارٹی میں کام کرتا ہے تو اُس کی ایک ہی کلاس ہوتی ہے جو محنت کشوں کی ہوتی ہے اس کا وہ نمائندہ ہوتا ہے، انہیں میں دری پر سوتا ہوا دیکھتا ہوں۔ پتلون پہنا ہوا آدمی دری پر بیٹھنے میں دقت محسوس کرتا ہے آخر میں بھی تو آکر اسٹول پر ہی بیٹھ جاتا ہوں۔ جہاں تک صاف کر کے بیٹھنے کا تعلق ہے مجھے اس میں کوئی بُرائی نظر نہیں آتی۔ یہ آپ جس دری پر بیٹھے ہیں اس کو جب سے خریدا ہے، کبھی دھویا نہیں ہوگا۔ اس کو دھولیا کریں۔ صاف رہنا صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ چچا علی جان ہنسے اور کہا اتنا وقت کہاں ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا ان کے کمرے میں فرش پر جگہ جگہ سگریٹ اور بیڑی کے ٹکڑے اور سگریٹوں کے خالی پیکٹ بکھرے

ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ کافی عرصہ سے جھاڑو نہیں لگائی۔ ناصر کی نظر ان پر نہیں پڑی۔

چچا علی جان کافی ضعیف ہو گئے تھے موٹاپے کی بیماری شوگر کی وجہ سے مریض ہو گئے تھے اسی مرض میں مبتلا رہ کر وفات پا گئے۔

ان کی وفات کے بعد تجہیز و تکفین پر ایک تنازعہ پیدا ہو گیا تھا، محلے کے بعض انتہا پسند مذہبی جنونیوں نے ان کی نماز جنازہ اور قبرستان میں دفن کرنے سے منع کر دیا تھا۔ باوقت تمام دوسرے علاقے کی مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی اور اُسی علاقے میں دفن کیا گیا۔

کامریڈ اقبال علوی

کراچی کی ادبی، ثقافتی، سماجی وسیاسی جد و جہد اور سرگرمیوں کی تاریخ اقبال علوی کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ایسی متحرک شخصیت جو لاؤڈ سپیکر کی ٹیسٹنگ سے لے کر خطبۂ صدارت استقبالیہ اور تقریبات کی نظامت کے فرائض احسن طریقے سے انجام دینا، اجتماعات کو ترتیب دینا اور اُس کی فرداً فرداً اطلاح کرنا یہ گزشتہ 60 سال سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایسی متنوع شخصیت بہت کم ملیں۔ نہایت حلیم الطبع، منسکر المزاج اور ہر وقت پر جوش انداز میں لوگوں سے ملاقات کرنا ان کا خاصہ ہے کراچی کی انتظامیہ ان سے اس قدر خائف اور خوف زدہ رہتی تھی کہ ہر گرفتاری میں اقبال علوی شامل نہ ہوں تو مکمل نہیں سمجھی جاتی چنانچہ بے شمار دفعہ گرفتار ہوئے۔ حسن ناصر کے ساتھ گرفتار ہونیوالوں میں یہ بھی شامل تھے ہم جیل میں ایک ساتھ رہے بڑے صبر اور تحمل و بے فکری کے ساتھ جیل میں رہا کرتے کہ اس کے عادی ہو گئے تھے۔

حیدر آباد کے صوبے اورنگ آباد کے تاریخی شہر سے ان کا تعلق تھا۔ ترقی پسندی کے صحت مند جراثیم وہیں سے لے کر پہنچے تھے۔ یہاں پاک سوویت کلچرل ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری بنے جس کے صدر جی ایم سید تھے۔ پاکستان اور سوویت یونین کے عوام، دانشوروں اور فنکاروں کو ایک دوسرے سے متعارف کروانے اور اس کے ذریعہ علمی، ادبی اور ثقافتی تقریبات کے انعقاد کا ایک طویل سلسلہ تھا جو سوویت یونین کے خاتمے تک جاری رہا۔ اقبال علوی اپنی روش اور عادت کے مطابق لاؤڈ سپیکر کی ٹیسٹنگ سے لے کر خطبہ استقبالیہ تک تمام فرائض اس وقت بھی انجام دیا کرتے تھے۔ ایسے دلچسپ، رنگارنگ اور فکر افروز اسٹیج شو اور تقریبات اب بہت کم ہو کر رہ گئی ہیں۔

اقبال علوی آج کل ارتقا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز سے وابستہ ہو گئے ہیں وہ اس کے ایک فعال اور متحرک رکن ہیں۔

پچھلے دنوں کراچی پریس کلب میں جناب منہاج برنا کی شاعری کی کتاب کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اقبال علوی اس تقریب کے لیے خطبہ استقبالیہ پیش کر رہے تھے۔ حاضرین میں اس منصب اور مقام کے لیے ان سے بہتر کوئی دوسرا موزوں بھی نہیں تھا۔ جو منہاج برنا سے نصف صدی کا واقف ہو۔

اقبال علوی، چاق و چوبند ہیں، صحت مند ہیں اور وہی ازلی مسکراہٹ ہے جو چہرے پر پھیلی ہوئی دوسروں کو بھی مسکرانے، صحت مند رہنے اور زندہ رہنے کا پیغام دیتی ہے۔ اقبال علوی کراچی میں ترقی پسندوں کا نشان اور اُن کی پہچان ہیں۔

سمیع داد خان

سمیع داد خاں ٹریڈ یونین فرنٹ پر کام کرتے تھے۔ ناصر کے بااعتماد ساتھیوں میں سے تھے یہ چار بھائی تھے اور چاروں سے ناصر کا رابطہ تھا۔ ان کے بڑے بھائی وزارت صنعت وتجارت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ سمیع داد خان، امیر فیصل درانی اور سلطان بھائی چمڑے کی اور ہاتھ کے بنے ہوئے جوتوں کی برآمد کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ کچہری روڈ پر ڈیلٹا شو کمپنی کے نام سے ان کا دفتر بھی موجود تھا۔ سمیع داد خان، شوانڈسٹری کے ورکرز کی ایک بہت بڑی تعداد لارنس روڈ، شو مارکیٹ اور گاندھی گارڈن کے علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی، کو منظّم کرنے اور اُن کے مسائل کے حل کی جدوجہد میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔

سمیع داد خان 1959ء کے بلدیاتی انتخابات میں اپنے حلقے سے کونسلر اور پھر اسی حلقے سے چیئرمین منتخب ہوئے تھے۔ کراچی بھر سے پارٹی نے کونسلر شپ کے لیے گیارہ امیدواروں کو کھڑا کیا تھا اور حیرت انگیز طور پر یہ سب کامیاب ہوگئے تھے۔ اس مہم کی تمام تر منصوبہ بندی اور جزویات حسن ناصر کی ولولہ انگیز قیادت کی مرہون منت تھی۔ ہم سب لوگ اس میں دن رات مشغول رہے اور کارکنوں نے بڑی جانفشانی سے کام سرانجام دیا۔ ان تمام کونسلرز کے نام اب مجھے یاد نہیں ہیں لیکن چند ایک کے نام اس طرح تھے۔ پیر کالونی سے انیس احمد ایڈووکیٹ، لالوکھیت سے علاؤالدین عباسی صدر کنٹونمنٹ سے سمیع داد خان، جوبلی سینما رنچھوڑ لائن سے اسحاق کاشمیری، لانڈھی مزدور ایریا سے عنایت اللہ خان وغیرہ۔

7 اگست 1960ء کو میں پیر کالونی کے بس اسٹاپ پر پہنچا ہی تھا کہ میری ملاقات سمیع داد خان سے ہوگئی جو بہت پریشان تھے اور روندھی ہوئی آواز سے کہہ رہے تھے کہ حسن ناصر

'گرفتار ہو گئے۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے چیخ کر کہا وہ کیسے، انہوں نے آب دیدہ ہو کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ ہم بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر شام کے اخبارات کا انتظار کرنے لگے جو دوپہر کو نکل آتے ہیں کچھ دیر بعد اخبار نئی روشنی آ گیا ہم نے لپک کر اُسے دیکھا تو سامنے ہی کے صفحہ پر ناصر کی گرفتاری کی خبر چھپی ہوئی تھی۔ ناصر کی گرفتاری 7 اگست کی صبح ہی کو عمل میں آئی ہوگی جسے نئی روشنی نے سب سے پہلے بریک کیا۔ ہمارا اگلا قدم یہ تھا کہ ہم لوگ اپنی تمام مصروفیات کو ختم کر کے گھروں پر ہی رہیں۔

8 اگست کو 8 بجے شام میری حسن ناصر سے ملاقات طے تھی۔ میں جذباتی طور پر بے اختیار نمناک آنکھوں سے اپنے کیے ہوئے وعدے کو ایفا کرنے کے لیے ناصر کی بتائی ہوئی جگہ پر ٹھیک 8 بجے پہنچ گیا اور ناصر کے کہنے کے مطابق کہ اگر 5 منٹ سے اوپر ہو جائیں تو سمجھو کہ کوئی حادثہ ہو گیا یا پھر گرفتار ہو گیا۔ میں 8 بج کر 10 منٹ پر ناصر کی گرفتاری اور گرفتاری کے حادثے کو حقیقت ماننے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا اور بوجھل قدموں سے چلتا ہوا واپس گھر پہنچا۔

شہر میں گرفتاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ کچھ لوگوں کو پوچھ گچھ کے لیے گرفتار کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ میں نے اپنا گھر نیا نیا تبدیل کیا تھا۔ لوگ میری جگہ سے واقف نہیں تھے۔ پولیس نے ایک بھاری جمعیت کے ساتھ میرے ایک واقف کار کو لے کر 12 اگست کو رات 1 بجے میرے گھر سے مجھے گرفتار کر لیا۔ سمیع داد بھی گرفتار کر لیے گئے۔ مجموعی طور پر 11 افراد کو گرفتار کیا گیا جن کے نام یہ ہیں۔

طفیل عباس، اقبال علوی، اظہر عباس، رضا کاظم ایڈووکیٹ، انیس احمد ایڈووکیٹ، محمد فصیح، سمیع داد خان، امیر فیصل درانی، محمد اسحاق کاشمیری، عبدالودود اور میں۔ مجھے سمیع داد اور محمد فصیح کو سیاسی تاریخ کی بدترین اذیتوں سے گزرنا پڑا جو ایک علیحدہ کہانی ہے۔

رہائی کے بعد بھی سمیع داد نے اپنے کام کو جاری رکھا۔ ہر جلسے اور مظاہرے میں شریک رہتے۔ بہت دور سے آیا کرتے تھے۔ بسوں میں سفر کرتے تھے۔ نگاہیں کمزور ہو گئیں تھیں بسوں میں بیٹھ کر کہیں سے کہیں نکل جایا کرتے تھے۔ کافی ضعیف ہو گئے تھے۔ ایک ٹریفک حادثے میں سر کو شدید چوٹیں آئیں، جناح ہسپتال میں داخل تھے۔ صحت یاب ہو کر گھر آ گئے بچوں نے اُن کا باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ گھر ہی پر رہنے لگے تھے۔ اسی حالت میں ایک بار پھر بیمار ہوئے اور وفات پا گئے۔

کامریڈ حسن ناصر کا ایک مشہور اسکیچ

کامریڈ حسن ناصر شہید (نوجوانی کی تصویر)

حسن ناصر شہید کے بڑے بھائی اور بھابھی ان کی والدہ (زہرہ آپا) کے ہمراہ

حسن ناصر شہید کے بھائی، بھابھی اور والدہ اپنے بچوں کے ساتھ

اسما عزیزی کامریڈ حسن ناصر کی والدہ (زہرہ آپا) اور دیگر رشتہ داروں کے ہمراہ

حسن ناصر کی والدہ (زہرہ آپا) بڑے بھائی، بھابھی

ڈاکٹر اعزاز نذیر دادا امیر حیدر کے ساتھ

ڈاکٹر اعزاز نذیر، نذیر عباسی اور حمیدہ گھانگرو کے ساتھ

بائیں سے دائیں کرسیوں پر بیٹھے ڈاکٹر اعزاز نذیر خان عبدالولی خان، میر غوث بزنجو،
ارباب سکندر خان خلیل، میاں محمود علی قصوری، شیخ عبدالمجید سندھی، محمود الحق عثمانی، شیخ ظہیر الٰہی

اعز عزیزی کی نوجوانی کی ایک یادگار تصویر
جس میں مولانا بھاشانی اور باچا خان نمایاں نظر آ رہے ہیں

ڈاکٹر اعزاز نذیر محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ اُن کی انتخابی مہم کے دوران

حیدر آباد میں فیض احمد فیض کی صدارت میں یوم مخدوم محی الدین منایا گیا (دائیں سے بائیں) فیض احمد فیض، بیگم طاہرہ آغا، ڈاکٹر رکن الدین حسنی، ڈاکٹر عالیہ امام، کوکب جمیل، جمال الدین بخاری، فتح اللہ عثمانی، پروفیسر مسلم شمیم، عثمان ڈیلائی، اعز عزیزی، رؤف شیرازی، ڈاکٹر اعزاز نذیر نے خطاب کیا

امام علی نازش، اعزاز نذیر اور مرزا ابراہیم
پیچھے شبیر شر بھی نظر آ رہے ہیں۔

مظہر جمیل اور اعز عزیزی، ایک خوشگوار موڈ میں

ولی خان اور ڈاکٹر اعزاز نذیر دیگر دوستوں کے ہمراہ

اعزعزیزی، سوبھوگیان چندانی اور دیگر مہمان

دادا امیر حیدر
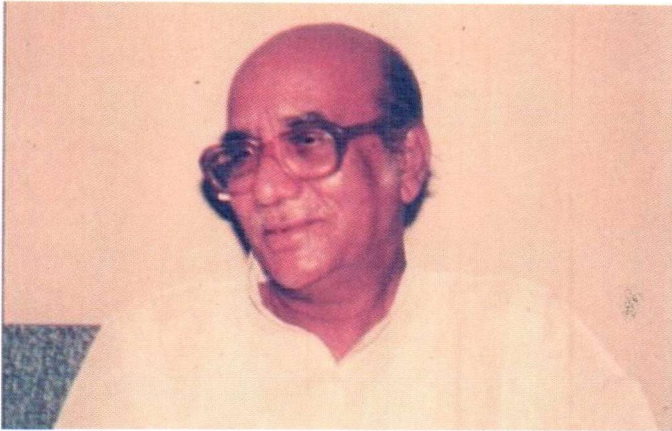
فتح اللہ عثمانی

سجاد ظہیر

امین مغل، اعزاز نذیر، چوہدری رفیق اور معروف شاعر احسان دانش نمایاں ہیں
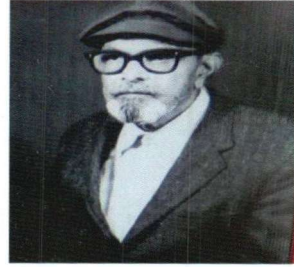
جمال الدین بخاری

امام علی نازش

سائیں عزیز اللہ

کامریڈ حسن
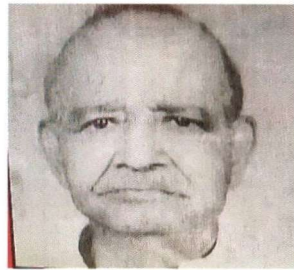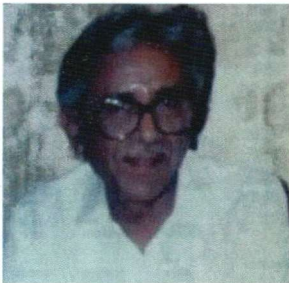
فصیح الدین سالار

ڈاکٹر منظور احمد

اعز عزیزی کی اپنے بچوں کے ساتھ آخری تصویر جو اُن کے انتقال سے کچھ دن پہلے لی گئی تھی۔

اعزعزیزی اپنی اہلیہ اسماء عزیزی کے ساتھ، دو مختلف ادوار کی تصویریں

اعز عزیزی اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر اعزاز نذیر اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ

اعز عزیزی اور اُن کے برادرِ نسبتی (مشہور نقاد) مظہر جمیل اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ

کامریڈ وہاب کانپوری

پیر کالونی میں جیل کے عقب میں جو مہاجر بستی تھی اس کا نام عظیم بستی تھا۔ یہاں بڑی بلند پایہ شخصیت قیام پذیر تھی جن کا نام کامریڈ وہاب کانپوری تھا۔ آپ کو ہندوستان میں کامریڈ پی، سی، جوشی کے ساتھ ٹریڈ یونین میں کام کرنے کا شرف حاصل تھا۔ یہ بہت لاغر اور ضعیف تھے۔ ایک پرانی پھٹی ہوئی دری پر بیٹھے ہوئے مل جاتے۔ ان سے ملنے کے لے بے شمار لوگ آیا کرتے خاص طور پر نوجوان مزدور جو مختلف ملوں میں کام کرنے والے ہوتے، ان سے اپنے طبقے کا سیاسی شعور حاصل کرنے اور اُس کا درس لینے کے لیے پہنچ جایا کرتے۔ میں بھی کبھی کبھار حاضری دینے پہنچ جاتا۔ حسن ناصر ان کی گفتگو میں شامل ہونے کی ہدایت کرتے۔ یہ مارکسزم کو اپنے مخصوص انداز میں سمجھاتے۔ مارکسزم کو مارکس وات اور مارکسسٹ کو مارکس وادی کہا کرتے۔ طبقاتی تقسیم اور اُس کی ازلی کشمکش کو نہایت سیدھے اور سلیس انداز میں بیان کرتے اور بڑے پیچیدہ مسائل کو بڑی سلاست سے پیش کر دیتے کہ سننے والے کے ذہن نشین ہو جاتے اور الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ معروف ٹریڈ یونین رہنما کامریڈ زبیر ان کو اپنا استاد بیان کرتے اور ان کے ساتھ ہندوستان میں کام کرنے کو اپنا اعزاز تسلیم کرتے تھے۔

کامریڈ وہاب کانپوری ایک دن اپنی جھونپڑی میں مردہ پائے گئے۔ اُن دنوں ہم لوگ جیل میں تھے اور ناصر شہید ہو چکے تھے۔ ان کی موت طبعی تھی۔ ناتوانی اور ضعیفی اس کا باعث تھا۔

خواجہ محمد فضل اللہ

حیدرآباد دکن کے نظام کالج سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کرنے کے بعد پاکستان آئے۔ لاہور میں آباد ہونے کی کوشش کی، وہاں اخبارات میں کام کرتے رہے لیکن حالات سازگار نہیں تھے۔ کراچی کا رُخ کیا اور یہاں ہاشمی کین کی غیر ملکی کمپنی میں لیبر آفیسر ہو گئے۔ ترقی پسندی کی چھاپ دکن ہی سے لگی ہوئی تھی۔ مزدوروں اور انتظامیہ کے درمیان ایسی خوشگوار فضا قائم کی کہ منگھوپیر کی تمام مزدور فیکٹریوں کے مقابلے میں یہاں کے حالاتِ کار، تنخواہیں اور مراعات سب سے بہتر تھے۔ اُن کا زیادہ تر وقت مزدوروں میں گزرتا تھا اور وہ کھانا بھی مزدور کینٹین میں کھایا کرتے تھے جبکہ آفیسر موجود تھا۔

وہ شہر میں جہاں بھی کوئی مظاہرہ ہوتا رکشہ پکڑ کر پہنچ جاتے اور آنے کے ساتھ ہی کوئی پلے کارڈ یا بینر اُٹھا لیتے۔ وہ چونکہ دفتر سے آ رہے ہوتے تھے اس لیے اُجلے اور پُرتکلف لباس میں ہوتے لیکن وہ پلے کارڈ یا بینر کو اپنے آگے اس طرح رکھ لیتے کہ صرف اُن کا چہرہ نظر آتا اس طرح وہ عام لوگوں میں شامل ہو جاتے اور یہ اُن کا ہمیشہ سے معمول رہا۔ کتابوں اور اخبارات سے ہر وقت لدے پھندے ہوتے۔ گھر میں بھی کتابوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔

انگریزی ادب اور اُردو ادب کا بڑا وسیع مطالعہ تھا اور ہر موضوع پر بڑی مفصل اور مدلل گفتگو کرتے۔ ہم لوگ انہیں پروفیسر کہا کرتے تھے۔ مظاہروں میں پلے کارڈ اور بینر پکڑ کر چلنے کا رجحان کی ابتدا ان ہی اسے ہوا ورنہ بعض کارکن اس سے خود کو بچائے رکھتے تھے۔ ہر مظاہرے کے بعد کارکنوں کو لے کر کسی چائے خانے میں پہنچ جاتے اور جتنے لوگ ہوتے اُن سب کو چائے پیش کرتے، 45 سال کی عمر تک مجرد رہنے کے بعد شادی کی۔ شہر کی دیگر ثقافتی اور سیاسی تقریبات میں

بھی تمام کارکنوں کو ساتھ لے کر پہنچتے تھے اور اُن کی آمد ورفت کے اخراجات بھی خود ہی برداشت کیا کرتے تھے۔ پان اور سگریٹ کا بے حد استعمال کیا کرتے تھے اور سب کو اس میں شامل کرتے تھے۔

دراز قد، چوڑا بدن، چوڑی پیشانی، بری بڑی آنکھیں اور فوجیوں والی مونچھیں رکھتے تھے۔ شرٹ اور پتلون کے نیچے ہمیشہ چپل پہنا کرتے تھے۔ میں جب گرفتار ہوا تو میری جیب سے اِن کی پارٹی فنڈ میں دی ہوئی رقم جو معقول تھی برآمد ہوئی جس پر مجھے کافی تشدد برداشت کرنا پڑا وہ اس رقم کا ذریعہ معلوم کرنا چاہتے تھے میں اس کو اپنی ذاتی رقم بتاتا رہا۔ دراصل میری گرفتاری کی وجہ سے مجھے موقعہ نہیں ملا کہ میں اس کو آگے پہنچا سکوں پروفیسر فضل اللہ کو حلق کا کینسر ہو گیا مزید براں حلق میں مچھلی کا کانٹا بھی پھنس گیا تھا جس نے زخم کو مزید نقصان پہنچایا۔ اس تکلیف سے جانبر نہ سکے اور انتقال فرما گئے۔ ان کی موت سے پارٹی کا ایک سرگرم کارکن مزدوروں کا ہردل عزیز لیبر افسر جو دراصل خود محنت کی عظمت کا علمبردار تھا ہم سب سے بہت جلد جدا ہو گیا۔

محمد علی ملباری

ہندوستان کے صوبہ کیرالہ (مدراس) سے تعلق تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے تھے اور ٹریڈ یونین آفس میں کل وقتی کارکن کی حیثیت میں کام کرنے لگے۔ ان کا نام محمد علی تھا پولیس والوں نے چونکہ یہ ملیالم اور تامل زبان بولا کرتے تھے ان کے نام کے ساتھ ملباری لگا دیا جو بعد کو ان کے نام کا حصہ بن گیا۔

1954ء میں جب کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگی تو ٹریڈ یونین آفس بھی اس کی زد میں آ گیا۔ کراچی سے جو کارکن گرفتار ہوئے اُن میں محمد علی بھی شامل تھے۔ یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی بعد کو وہ بے شمار دفعہ گرفتار اور رہا ہوتے رہے۔ کراچی میں جو بھی سیاسی سرگرمی ہوئی اور اُس کی پاداش میں جو بھی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ محمد علی ملباری اس میں ضرور شامل ہوتے۔ اس طرح وہ کراچی کی سیاسی سرگرمی کا جزو ہو گئے تھے۔ وہ خود بھی نہایت مستقل مزاج، پُرعزم اور پارٹی کے جانثاروں میں سے تھے۔ ہر جلسے، ہر جلوس اور ہر مظاہرے میں وہ شریک ہوتے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بیڑی ورکر تھے اور کراچی میں بیڑی ورکرز کو منظم کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ٹیکسٹائل ورکرز، گودی ورکرز، خاکروب یونین، شو ورکرز اور بیڑی ورکرز کراچی کی اہم تنظیمیں تھیں۔ بار بار گرفتار ہونے کی وجہ سے اِن کا پیشہ متاثر ہوتا رہا۔ بعد کو سولجر بازار میں سن رائز ریسٹورنٹ کے پیچھے بیڑی بنانی شروع کی اور اُسی جگہ رہائش بھی اختیار کر لی۔

کراچی میں NAP کے دفتر تقریباً روز ہی آ جایا کرتے تھے اور یہاں شہر بھر کی سیاسی سرگرمیوں کے منصوبوں میں شریک رہتے۔ حسن ناصر کی ہلاکت کے بعد بہت دلبرداشتہ رہے۔ روسی، چینی اختلافات نے انہیں مزید الجھا دیا جس کی وجہ سے ان کی صحت بھی متاثر ہونے لگی۔ بعد

کوانہوں نے منہاج برنا کی رہائش کے پاس ایک چائے کا کھوکھا لگا لیا وہی اُن کی گزر بسر کا ذریعہ تھا۔ باقی زندگی بڑی خاموشی سے گزاری۔ وہ ساری زندگی کراچی میں رہے اور تنگ دستی و بیماری کے مصائب برداشت کرتے رہے اور کیرالہ واپس جانے کو پاکستان کی حب الوطنی کے خلاف عمل سمجھتے تھے جبکہ اُن کے بہت سے ساتھی واپس جا چکے تھے۔

واحد بشیر

حیدرآباد کالونی میں مجرد (بیچلر) نوجوانوں کے لیے بے شمار چھوٹے کمرے موجود تھے اب بھی ہیں۔ ان میں کئی انقلابی شخصیات مقیم رہیں۔ کامریڈ عزیز سلام بخاری، سید احمد، اعزاز نظیر، ڈاکٹر رشید حسن خان، ڈاکٹر امیر الدین شاعروں اور ادیبوں میں عبدالرؤف عروج، تحسین سروری، قمر ساحری وغیرہم ان ہی میں سے ایک کمرے میں جو جیل کے سامنے سڑک پر واقع تھا، واحد بشیر بھی مقیم تھے جو شاعری کرتے تھے اور طالب علموں کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔ ان کے کمرے میں ہر وقت نوجوان جمع رہتے۔ ادب اور سیاسیات پر گفتگو رہتی۔ شہر میں جلسوں اور مظاہروں میں شرکت کے پروگرام بنتے۔

میری ان سے واقفیت اور دوستی ایسے ہی موقعوں پر قائم ہوئی۔ یہ بہت دھیمے انداز سے بات کرتے۔ بہت دُبلے پتلے اور چھوٹے سے قد کے آدمی تھے لیکن شاعری بہت بلند اور بھاری بھر کم ہوتی۔ یہ اپنی تقریروں میں کالا باغ کی مونچھوں کا بڑا مذاق بنایا کرتے تھے اور بڑی داد حاصل کرتے۔ کراچی بدر ہونے والے طالب علموں کے 12 اماموں میں ایک یہ بھی تھے۔

ایوب خان کا مارشل لا لگ چکا تھا۔ حسن ناصر بمعہ اپنے 3 دیگر ساتھیوں کامریڈ عزیز سلام بخاری، کامریڈ شرف علی اور کامریڈ امام علی نازش کے روپوش تھے۔ میں شہر بھر میں ان کے رابطوں کو بحال رکھنے اور پھیلانے کا فرض ادا کیا کرتا تھا۔ میری ناصر سے تقریباً روز ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ہم جگہ بدل بدل کر ملا کرتے تھے۔ ناصر مختلف حلیوں میں ہوتے۔ ایک دن واحد بشیر سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے دن، وقت اور جگہ معلوم کی اور اُس کے مطابق اگلے روز واحد بشیر کو لے کر نکل پڑا۔ ہم لوگ شہر سے دور نارتھ ناظم آباد کے ایک ویرانے میں پہنچے،

اُن دنوں یہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ ہم چلتے چلتے قصبہ کالونی کی پہاڑیوں کے دامن میں پہنچ گئے جہاں حسن ناصر ہمارا انتظار کر رہے تھے انہیں پہنچے 3,4 منٹ ہوئے تھے وقت کی پابندی ایسی ملاقاتوں میں بڑی اہمیت کی حامل تھی اور اس پر عمل کرنا میرا اولین فرض تھا۔ ناصر نے کہا آؤ ان پہاڑیوں کے اوپر چلتے ہیں۔ ہم پہاڑی کے اوپر پہنچے تو ناصر واحد بشیر کو تخلیئے میں لے کر پہاڑی کے دوسری جانب چلے گئے۔ اتنے فاصلے پر کہ مجھے دونوں کی گفتگو سنائی نہ دے، میں پہاڑی پر بیٹھے خنک ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب گفتگو ختم ہوئی تو ہم لوگ پہاڑی سے اُتر کر نیچے آئے کچھ دور جا کر واحد بشیر کو الوداع کیا۔ پھر میں اور ناصر اپنے اگلے پروگرام پر چل نکلے۔ راستے میں ناصر کا موڈ بہت بگڑا ہوا تھا میں ٹھٹھک گیا اور وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کامریڈ آپ نے ایک غلطی کی ہے جس کا ذکر واحد بشیر نے ابھی ابھی مجھ سے کیا ہے، میں نے تفصیل جاننا چاہی تو کہا آپ نے واحد بشیر کے ایک روم میٹ سے پارٹی فنڈ کے لیے کہا جو واحد بشیر کے رابطے میں ہیں۔ میں نے وضاحت میں عرض کیا عبدالقیوم صدیقی سے میرے پُرانے مراسم ہیں، ان کے بڑے بھائی جن سے آپ واقف ہیں۔ لاڑکانہ میں پارٹی کے ممبر ہیں۔ شعور صدیقی میرے بھی دوست ہیں انہوں نے مجھ سے کہا کہ اِن کا بھائی ان دنوں کراچی آیا ہوا ہے اس سے رابطہ کریں اور کہیں اُسے بتھائیں۔ قیوم صدیقی ایک انشورنس کمپنی میں کام کرتے تھے سیاسی فرنٹ کے آدمی تھے اب انہوں نے چند دنوں سے شام کی کلاسیں جانی شروع کی ہیں۔ ان پر پہلا حق ہمارا بنتا ہے اس لیے میں نے اُن سے PF کے لیے کہا۔ ناصر میری وضاحت پر بڑی دیر بعد نارمل ہوئے۔ لیکن میری یہ شکایت میری نہ کردہ گناہی کی آج تک مجھے سزا دے رہی ہے۔ اور احساس ہے کہ ناصر چند لمحوں ہی کے لیے سہی مجھ سے خفا رہے۔ کامریڈ واحد بشیر اس بات کو بھول گئے ہوں گے لیکن یہ واقعہ ایک پیکاں کی طرح میرے لیے آج تک میری روح میں پیوست ہے۔ واحد بشیر اپنی جگہ درست تھے انہوں نے رازداری اور احتیاط کو پیش نظر رکھ کر ناصر سے اس کا ذکر کیا۔ میں بھی اپنی جگہ صحیح تھا۔ قیوم صدیقی کی پوزیشن دوہری ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے مغالطہ پیدا ہوا۔

واحد بشیر تحریک کی ایک بہت سرگرم طالبہ حمزہ میں دلچسپی لیتے تھے جو کامریڈ شرف علی کی چھوٹی بہن بھی تھیں ان دونوں کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ حمزہ کی والدہ تھیں جو اپنے داماد

کوصوم وصلواۃ کا پابند دیکھنا چاہتی تھیں۔ خود بہت مذہبی خاتون تھیں۔ اس مسئلے کو کامریڈ شرف علی نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا۔ والدہ کو راضی کیا اور یہ شادی ہوگئی۔ یہ ایک کامیاب شادی ثابت ہوئی۔ ان کی ایک لڑکی معروف سرجن ہے اور بیٹا انجینئر۔ حمزہ کا پچھلے دنوں انتقال ہوگیا۔

واحد بشیر ارتقاء انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں اور سہ ماہی ارتقا کے حلقۂ ادارت میں شامل رہے ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کو دوبارہ بحال کرنے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ شہر کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کو بڑی ثابت قدمی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بہت موٹے ہو گئے ہیں، بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن عزم وہمت جوان ہے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ناصر کے ساتھ گزاری ہوئی پہاڑی کی وہ شام یاد آتی ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد

ڈیموکریٹک اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بنیادگزاروں میں سے تھے۔ حیدرآباددکن سے ان کا تعلق تھا۔ پارٹی کے سرگرم کارکنوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ڈرگ روڈ کالونی میں اپنی ڈسپنسری قائم کی، بہترین معالج اور انسانی ہمدردی کے پیکر کی حیثیت سے ایسی شہرت حاصل کی کہ بہت کم لوگوں کو یہ نصیب ہوئی۔ ناداروں کا مفت علاج کرتے تھے اور باقی لوگوں سے فیس نہایت معمولی وصول کرتے۔ ان تک پہنچنے کے لیے کالونی میں صرف ان کا نام لے لینا کافی تھا۔ ان دنوں سخت علیل ہیں یادداشت کے کھو جانے کی بیماری ''ڈیمنشیا'' لاحق ہے۔ آخری وقتوں تک پارٹی میں سرگرم رہے۔ پارٹی کی پالیسیوں سے شدید اختلاف تھا لیکن پارٹی چھوڑ کر جانے یا توڑ دینے کو بنیادی اصولوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ انہیں کامریڈ نازش سے اختلاف تھا، بعد کو ان کی اہلیہ ڈاکٹر بلقیس نے اس اختلاف کو ذاتی اور نجی رنگ دے کر دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل کردی۔ اور یہ ہی اختلاف دونوں میاں بیوی کی علیحدگی پر منتج ہوا۔ بچے ان کے جوان ہو چکے ہیں، شادیاں بھی ہو گئی ہیں لیکن میاں بیوی میں صلح کے کوئی امکانات نہیں ہیں۔ ڈسپنسری بند ہو چکی ہے۔ کالونی کے مریض دوردراز کے علاقوں میں جانے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں۔ اکثر انہیں یاد کر کے روتے اور ان کی صحت یابی و واپسی کی دعائیں کرتے ہیں۔

میں نے آج سے 40 سال قبل ان کے پاس کامریڈ عبدالسلام کے چھوٹے بھائی کو ایک پرچی دے کر بھیجا کہ ان کی مدد کریں۔ ڈاکٹر منظور نے اس کاغذ کے پُرزے کی ایسی پذیرائی کی کہ اس لڑکے کو اپنے پاس رکھ لیا، اُسے ڈسپنسنگ سکھائی۔ امتحان پاس کروایا اب وہ لڑکا اگرچہ کہ

بوڑھا ہو چکا ہے، ساری زندگی اسی ہنر کے تحت بڑی اطمینان سے زندگی بسر کی۔ ایسے بہت سے نوجوان ہیں جن کی انہوں نے دست گری کی اور اُن کی زندگی بنا دی۔ جناح ہسپتال میں دیگر ڈاکٹروں سے ان کی بہت اچھی ملاقات تھی۔ میں خطرناک مریضوں کو ان کے پاس بھیجتا جو جناح ہسپتال سے شفایاب ہو کر لوٹتے۔

ڈاکٹر منظور ایک واقعہ سے بہت یاد آتے ہیں۔ غالباً 1968ء کا واقعہ ہے۔ ناظم آباد کراچی میں پارٹی کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی جس میں پورے ملک سے نمائندے شریک تھے۔ صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) سے اجمل خٹک پنجاب سے شمیم اشرف ملک، پروفیسر امین مغل اور حسن رفیق وغیرہ۔ کانگریس شروع ہونے سے قبل تمام شرکا کھڑے ہو گئے، اپنے سیدھے ہاتھ کو بلند کیا مٹھی بند کر کے انٹرنیشنل کی اور یجنل دُھن جو ڈاکٹر منظور لے آئے تھے بجائی گئی، اس دھن کا تصور کر کے آج بھی جسم میں خون کی روانی تیز ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ اور جو لمحات اس وقت گزرے اس کے سلسلے میں امین مغل نے کہا کہ ایسا احترام ایسی عقیدت اور ایسا نظم و ضبط میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ ہم سب ڈاکٹر منظور کے شکر گزار رہیں گے جب تک زندگی ہے۔ سائیں عزیز اللہ کے آخری لمحات میں ڈاکٹر منظور اُن کے قریب تھے اور اُن کی زندگی بچانے کی کوشش کرتے رہے۔

ڈاکٹر امیر الدین

ریگل چوک پر ایک مظاہرے کے بعد محمد شفیع طالب علم رہنما ایک کارنر میٹنگ سے مخاطب تھے۔تقریر بہت دھواں دھار ہو رہی تھی ہم سب دم بخود تھے اور بڑے انہماک سے تقریر سن رہے تھے۔ میں نے دیکھا سامنے ایک لڑکا (ہم بھی لڑکے ہی تھے) بہت اُچھل اُچھل کر چیخ چیخ کر نعرے لگا رہا تھا۔

گلی سڑی سرکار کو ایک ٹھوکر اور دو
گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو

کشادہ قد، گورا چٹا رنگ نعرے لگا لگا کر گاجر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ ہماری اُس پر نظر پڑنا لازمی امر تھا ہم چپکے سے اُس کے قریب گئے ہاتھ ملایا اور اُس کے نعروں میں شامل ہو گئے۔ جب میٹنگ برخاست ہوگئی تو ہم آپس میں متعارف ہوئے۔ نثار نام بتایا۔ایس ایم کالج میں انٹر میں پڑھ رہے تھے۔NSF کے سرگرم کارکن تھے ہم گفتگو کرتے قریب کے چائے خانے میں پہنچے، اُن دنوں جمال عبدالناصر کا بڑا غلغلہ تھا اور نثار اُن کے مداحوں میں سے تھے۔وہ جمال ناصر کو معر کا نجات دہندہ، سامراج دشمن، قوم پرست اور سوشلسٹ کہہ رہے تھے۔ہم سوشلسٹ اور قوم پرست کے فرق اور اس کے کردار پر اپنا موقف بیان کر رہے تھے۔ ہماری گفتگو کافی طویل ہوگئی۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا دوران گفتگو یہ بھی بتایا کہ حیدر آبادی ہیں اور حیدر آباد کالونی میں مقیم ہیں ہم سن کر بہت خوش ہوئے اور دوسرے ہی دن ان کے گھر پر پہنچ گئے۔ایک چھوٹا سا کمرہ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی دیوار سے تکیے لگے ہوئے تھے ایک کونے میں کتابوں کا ڈھیر اور دوسری جانب برتن

اور مٹی کے تیل کا اسٹور کھا ہوا تھا۔ ہم سمجھ گئے کہ کھانا خود ہی تیار کرتے ہیں۔ ایک اور دوست ساتھ رہتا ہے۔ اپنا پورا نام امیر الدین بتایا۔ اپنا خاندانی پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ لوگ مہدی ہیں۔ سید محمد مہدی جونپوری جنہوں نے اپنے نبی آخرالزماں ہونے کا دعویٰ کیا تھا کے ماننے والے ہیں۔ حیدر آباد دکن کے نامور خطیب بہادر یار جنگ بھی مہدی تھے اور مہدی جونپوری کے پیروکار تھے۔ مہدیوں ہی کی ایک شاخ ''ذکری'' جو حیدر آبد میں ''یداللہٰی'' کہلاتی تھی نثار اس سے تعلق رکھتے تھے میں شہداد پور میں باری کمیٹی کے ایک سرگرم کارکن شہاب الدین یداللہٰی سے واقف تھا۔ معلوم ہوا کہ نثار اُن کے بھتیجے ہیں مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ کراچی میں ذکریوں کی ایک بڑی تعداد پرانے گولیمار میں مقیم تھی جو سب بلوچی تھے بلوچستان میں بھی یہ لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

نثار کی گلی ہی میں میرے چند اور دوست مسعود سکندر، ابوسعید وغیرہ رہا کرتے تھے۔ میں نے نثار سے ان کا تعارف کروایا۔ اب یہ ایک اچھا گروپ بن گیا۔ اکثر و بیشتر ہماری ملاقاتیں ہونے لگیں، کتابوں کا تبادلہ ہونے لگا اور مظاہروں وجلسوں میں ایک ساتھ جانے لگے۔ واحد بشیر دوسری جانب رہا کرتے تھے ان سے بھی نثار کی اچھی واقفیت تھی۔

میں 1960ء میں گرفتار کر لیا گیا۔ رہائی کے بعد کراچی چھوڑنا پڑا CID کے سپاہی ساتھ ساتھ چلا کرتے۔ میں سکھر چلا گیا اور مظہر جمیل کے گھر میں مقیم رہا۔ اس عرصہ میں نثار کے علاوہ دیگر تمام ساتھیوں سے رابطے ختم ہو گئے۔ یہ دور بڑے ابتلا کا دور تھا۔ ایک خوف اور دہشت طاری تھی مارشل لا اپنے عروج پر تھا۔

ایک دن مظہر جمیل کے گھر کراچی میں ایک عشائیہ پر کچھ ادیب شاعر اور دانشور جمع تھے۔ میں بے ادب بھی مدعو تھا۔ میں نے دیکھا آپس میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک شخص سیاہ سوٹ میں تھا۔ چکی آواز اور طرزِ تکلم جانا پہچانا لگتا تھا، بار بار مجھے دیکھ رہا تھا اور میں بھی اُس کی طرف متوجہ تھا۔ ہم 22-20 سال بعد مل رہے تھے۔ سب کچھ بدل چکا تھا بڑھاپے کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں بہت موٹا ہو گیا تھا بال ختم ہو چکے تھے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لی تھیں کہ چہرہ کچھ متوازن نظر آئے۔ وہ بھی کافی صحت مند ہو گیا تھا۔ کن پٹیاں سفید ہو رہی تھیں۔ یہ کون ہے میں بہت دور ماضی میں چلا گیا۔ ریگل چوک کا مظاہرہ، محمد شفیع کی خطابت، گورے چٹے لڑکے کی نعرہ بازی جو

گاجر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ ارے یہ تو نثار ہے حیدر آباد کالونی کی گلی، کمرہ، کمرے میں دری بچھی ہوئی سب کچھ یاد آ گیا۔ میں بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنی نشست سے اٹھا اور قریب آ کر کہا حیدر آبادی ہو۔ کہاں ہوں میں نے از راہ تفنن کہا کھٹا کھاتے ہو، کہاں کھاتا ہوں ارے اعز؟ وہ مجھ سے بغلگیر ہو گیا اور ہم بہت دیر تک ایک دوسرے کو پیار کرتے رہے، لوگ ہمیں غور سے دیکھ رہے تھے اور حیرت زدہ تھے یہ ڈاکٹر امیر الدین تھا جو امریکہ سے تعلیمات میں PHD کر کے آیا تھا۔ کوئٹہ میں مقیم ہے وہاں ایک کالج کا پرنسپل ہے جو چھٹیاں گزارنے کے لیے آیا ہوا ہے۔

اب میں اور امیر الدین پھر ایک ساتھ گھومنے لگے۔ انہوں نے اپنے حلقہ احباب سے مجھے متعارف کروایا، راحت سعید، شمس الدین، حسن عابد، محمد علی صدیقی، شاہد نقوی، کرامت شیر وغیرہ۔

ہم لوگ روز کسی ایک کے گھر جمع ہو جاتے۔ تمام موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ ایک مرتبہ کرامت شیر کے فارم ہاؤس میں قیام کا پروگرام بنایا گیا رات وہیں بسر کرنی تھی اور الصبح اُٹھ کر سورج کے طلوع ہونے کا منظر دیکھنا تھا۔ اونچے اونچے ناریل کے درختوں کے درمیان سے۔ شمس نے اسے پو پھٹنے کا منظر بتایا اور بہت مذاق اُڑایا آؤ دیکھو کیسی پھٹتی ہے پو۔

برآمدے میں گول دائرے میں کرسیاں بچھا دی گئی تھیں اور ہم سب اندھیرے سے اُٹھ بیٹھے تھے۔ رات کی سیاہی سحر کی سپیدی روشنی میں تحلیل ہو رہی تھی۔ سورج جو ابھی کہیں چھپا ہوا تھا اُس کی شعائیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھیں اور اندھیرے کو نگلی جاری تھیں۔ شمس نے آواز دی دیکھو پو پھٹنے والی ہے۔ بالآخر سورج نے آہستہ آہستہ اپنا سر نکالا اور ہم کو صبح بخیر کہا۔ ہم سب نے ایک دوسرے کو صبح بخیر کہا۔ یہ منظر بہت سحر انگیز تھا بُھلایا نہیں جا سکتا۔

امیر الدین واپس چلے گئے۔ امیر الدین کی عادت شہد کی مکھی کی طرح تھی جہاں بیٹھے شہد چھوڑ دے۔ وہاں کوئٹہ میں بھی انہوں نے چند شہد کی مکھیوں کو جمع کر لیا تھا۔ یہ ہر اتوار کو کامریڈ عبداللہ جان کے گھر پر جمع ہو جاتے جو کوئٹہ میں بلوچیوں کے واحد سرخیل رہ گئے ہیں۔ یہاں کراچی آتے تو مختلف دوستوں سے مختلف فرمائشیں کرتے، میرے گھر کے پائے بڑے شوق سے کھاتے دو ایک مرتبہ یہ سلسلہ جاری رہا پھر میری اہلیہ کی وفات پر یہ ختم ہوا۔

امیر الدین اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ دوستی اور یاری خوب نبھاتے تھے۔ قہقہے

لگانا اور دوستوں کو بھی اس میں شامل کرنا ان کا وطیرہ تھا۔ ایک دن اپنی اہلیہ کو کراچی کے لیے ایئر پورٹ چھوڑ کر واپس ہو رہے تھے کہ کار کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اہلیہ کراچی پہنچیں تو دوسرے دن امیر الدین کے دوستوں نے ان کی میت کراچی پہنچائی۔

میرے کانوں میں وہ نعرے گلی سڑی سرکار کو ایک ٹھوکر اور دو گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو۔ گونجتے رہتے ہیں۔ جب امیر الدین یاد آتے ہیں۔ یہ نعرے آج بھی اتنے ہی مؤثر ہیں جتنے پہلے تھے۔

جوہر حسین

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے بنیادگزاروں میں سے تھے اور بڑی پُرجوش اور روانی سے تقریر کیا کرتے تھے۔شہر کے ہر مظاہرے اور جلسے میں ان کی شرکت بہت ضروری تھی بار بار قید و بند سے گزرے ان کا شمار اُن 12 طالب علموں میں ہوتا تھا جو ایوب کے دور میں کراچی بدر کیے گئے ان کو طالب علموں کے بارہ امام بھی کہا جاتا ہے۔ یہ معروف ماہر تعلیم اور دانشور پروفیسر کرار حسین کے بڑے صاحبزادے تھے۔محترمہ شائستہ زیدی جو کبھی طالب علمی کے زمانے میں شائستہ بیزار کہلایا کرتی تھیں ان کی بڑی بہن ہیں جو خود بھی معروف مقررہ اور خطیبہ ہیں۔اکثر محرم کی مجالس میں خطابت کے فرائض انجام دیتی ہیں۔تاج حیدر ان کے چھوٹے بھائی ہیں جو ادیب اور پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنماؤں میں سے ہیں۔ جب تک جوہر حسین سیاست کرتے رہے تاج حیدر سیاست سے دور ہی رہے، جوہر حسین کراچی بدری کے بعد کوئٹہ چلے گئے جہاں پروفیسر کرار حسین بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر تعینات تھے۔

میں بھی اپنی جیل سے رہائی کے بعد سندھ بھر کا چکر لگا کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں ہم سب نے معراج محمد خان کے گھر پر ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔آئے دن کراچی سے گرما گرم خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ترقی پسند فکر کی رہنمائی کرنے والے طالب علموں کی کراچی میں عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے دائیں بازو کی طلبہ تنظیموں نے کراچی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا جو باشعور اور محب وطن لوگوں کے لیے تشویش کا باعث ہو رہا تھا۔ان ہی دنوں میں جبل پور ہندوستان میں فرقہ وارانہ تعصب اور تشدد کے واقعات رونما ہوئے جن کو بہانہ بنا کر جمعیت نے کراچی میں ایک

بڑے مظاہرے کی قیادت کی، ہم کوئٹہ میں بیٹھے ان حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے تجویز دی کہ معراج محمد خان اور جوہر حسین کو اس موقع پر واپس کراچی چلے جانا چاہیے، میری تائید کامریڈ عبداللہ جان جمالدینی اور اسحاق عباسی ایڈووکیٹ نے بھی کی۔ طے یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن یہ دونوں کراچی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ ہم سب دوسرے دن صبح کوئٹہ ریلوے اسٹیشن پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جوہر حسین نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ چھوٹے اور تنگ تھے۔ ماجرہ یہ کھلا کہ پروفیسر صاحب نے شفقت پدری سے مغلوب ہو کر جوہر حسین کا سامان اور کپڑے اُٹھا کر اپنے کمرے میں رکھ لیا جس کی وجہ سے جوہر حسین نے اپنے چھوٹے بھائی کے کپڑے پہن لیے اور دوسرے دروازے سے نکل کر اسٹیشن پہنچے۔ ہم لوگ جوہر حسین کی اس حرکت پر ہنس بھی رہے تھے اور اُن کے احساسِ ذمہ داری اور دوستوں کی رائے کی پاسداری و فرض شناسی پر اُن سے بے اختیار بغلگیر ہو گئے اور اُنہیں اپنی نیک خواہشات کے ساتھ الوداع کیا۔ جوہر حسین اور معراج محمد خان نے کراچی پہنچ کر کراچی کی فضا کو یکسر تبدیل کر دیا۔ ان ہی دنوں پیٹرس لومبا کا قتل ہو گیا یہ وہ واقعہ تھا جس کے خلاف غم و غصے کے اظہار کے لیے ان لوگوں نے NSF کے تمام یونٹوں سے رابطہ کر کے ایک شاندار جلوس کا اہتمام کیا جس میں ہزاروں طالب علموں نے شرکت کی اس جلوس کی کامیابی اور کراچی کے باشعور عوام کی والہانہ پذیرائی اور تائید نے دیگر طالب علم رہنماؤں کی کراچی آمد کا راستہ ہموار کر دیا۔ جوہر حسین نے ایوب خان کی آمریت کے تمام عرصہ میں نہایت دلیری اور جرأتمندی NSF کی قیادت کی۔ بھٹو کے دور حکومت میں انہوں نے ملازمت اختیار کی اور پاکستان چھوڑ کر چلے گئے۔

جوہر حسین اگرچہ اس دُنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن فضاؤں میں اُن کی پرجوش خطابت دلوں میں ان کی فرض شناسی اور جرأتمندی پر ہوا کے جھونکے اور دھڑکتے دل میں محسوس کی جاتی رہے گی۔

وہ طویل القامت، منسکر المزاج، دلیری، ہمت اور مسکراتی شخصیت کے مالک تھے۔

ڈاکٹر ایم اے محبوب

نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کراچی کے پہلے صدر تھے۔ ان کا پورا خاندان ترقی پسندی اور روشن خیالی کے لیے مشہور ہے اور ہر ایک نے اپنی جگہ بہت اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر رکن الدین حسان سب سے بڑے بھائی تھے جنہوں نے بڑے پُر آشوب دور میں عوامی ادبی انجمن کی بنیاد رکھی اور پورے ملک میں اس کی شاخیں قائم کر دیں۔ فصیح الدین سالار کراچی کے معروف سیاسی کارکن تھے۔ ان کی بہن اقبال سلطانہ کو کراچی کی سرگرمیوں میں خواتین کی نمائندگی، جو وہ بڑی پابندی اور مستعدی سے کرتی تھیں، کا شرف حاصل ہے، ان کے برادر نسبتی اختر حسین پاکستان ورکرز پارٹی کے مرکزی رہنما ہیں۔

ڈاکٹر محبوب کے تعلق سے ایک دلچسپ واقعہ مشہور ہے۔ جو کراچی کی انتظامیہ کی بوکھلاہٹ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کراچی میں امریکی کا صدر آئزن ہاور کی آمد پر تمام طالب علم رہنما اور ترقی پسند کارکن پاکستان سیکورٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیے گئے ڈاکٹر محبوب کی گرفتاری احکامات بھی جاری کر دیئے گئے تھے لیکن وہ ملک سے باہر تھے۔ آئزن ہاور آیا اور چلا گیا۔ کافی عرصہ بعد ڈاکٹر محبوب جب کراچی پہنچے تو اُسی حکم کے تحت انہیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ اخبارات نے اس واقعہ کو خوب اُچھالا لیکن یہ اقدام حکومت کے لیے سانپ کے منہ کی چھچھوندر بن گیا تھا نہ نگلے بنے نہ اُگلے بنے۔ ڈاکٹر محبوب اپنی گرفتاری کا پورا عرصہ گزار کر باہر آئے۔ ڈاکٹر محبوب کافی ضعیف ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے بائی پاس آپریشن سے گزرنا پڑا۔ پائپ پینے کے بہت عادی تھے۔ اب بھی

ہاتھ میں پائپ دکھا نظر آتا تھا۔ پتہ نہیں پیتے بھی ہیں یا نہیں۔ لمبے چوڑے بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے شہر کے اجتماعات میں پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ اچانک معلوم ہوا کہ اُنھیں پھیپھڑوں کا کینسر ہوگیا ہے۔ وہ علاج کی غرض سے امریکہ چلے گئے جہاں اُن کا صاحبزادہ اسی مرض کے ماہرین میں شمار ہوتا ہے۔ بیٹے نے دن رات ایک کر کے باپ کا علاج شروع کیا اور چند دنوں میں اک موذی مرض پر قابو پالیا جو حیرت انگیز بات تھی۔ وہ صحت یاب ہو کے اپنے دوسرے بیٹے کے پاس لندن چلے گئے جہاں کی سخت سردی نے اُنھیں شدید متاثر کیا اور وہ نمونیہ میں مبتلا ہو کر 4 دسمبر 2010ء کو انتقال کر گئے۔ اُن کا جسد خاکی کراچی لایا گیا اور سخی حسن کے قبرستان میں دفنائے گئے۔ ڈاکٹر محبوب کا تعلق حیدرآباد کی تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانے سے تھا۔ ان کے خاندان میں PHD اور MBBS، Frcs جیسی اعلیٰ تعلیم کے حامل افراد کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر فرزانہ معروف ماہر اطفال ہیں۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی پروفیسر ڈاکٹر فہیم الدین کراچی میں اعلیٰ ثانوی بورڈ کے چیئرمین تھے اور بڑے بھائی ڈاکٹر رکن الدین خان فیضی صاحب کے دستِ راس سر عبداللہ ہارون کالج کے وائس پرنسپل تھے۔

''ایں کہنہ خاندان آفتاب است''

ڈاکٹر ملک شیر افضل

ان کا تعلق بھی طالب علموں کے اُس گروپ سے تھا جو حسن ناصر کے بہت قریب تھے۔ NSF ڈاو میڈیکل کالج کی یونٹ کے انچارج تھے۔ بہت متحرک، بڑے پُر جوش اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ پورے شہر میں گھوم پھر کر طالب علموں سے رابطے کرتے اور پیدل چلتے تھے۔ کہتے تھے جو کرایہ بچتا ہے وہ پھر میں پارٹی کے فنڈ میں واپس کر دیتا ہوں۔

ان کے سیاسی رجحان اور سرگرمیوں کو دیکھ کر انتظامیہ نے پانچ سال کے لیے کالج میں ان کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ یہ اس پابندی کے سزاوار شاید پہلے طالب علم تھے۔ سال سوم میں متعلم تھے کالج سے باہر ہو جانے پر خوش تھے کہ اب کل وقتی کارکن بن کر زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا موقع ملے گا۔ کراچی نے ملک شیر افضل جیسا طالب علم رہنما جس کو جنون کی حد تک اپنے کام سے لگاؤ تھا، بہت کم دیکھا ہے۔ قید و بند کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ دُبلے پتلے آدمی تھے۔ تیز تیز گفتگو کرتے تھے اور جملوں میں اپنے مخصوص الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ان کے کچھ معنیٰ تو نہیں ہوتے تھے لیکن ادائیگی ایسی بروقت ہوتی تھی کہ سامنے والا ان کا مطلب سمجھ جاتا تھا۔ یہ ان کی اپنی ڈکشن تھی۔

حسن ناصر کی ہلاکت کے بعد اس قدر برہمی کا اظہار کیا کہ اس وقت ان سے کوئی بھی حرکت سرزد ہو سکتی تھی۔ ساتھیوں نے سنبھالے رکھا اور تحریک کو مزید شدت کے ساتھ جاری رکھ کر ناصر کی شہادت کا بدلہ لینے کی صلاح دی۔ کہتے تھے اب پارٹی میں ناصر کے قد و قامت اور اُن جیسی صلاحیتوں والا کوئی موجود نہیں ہے۔ کراچی چھوڑ کر چلے گئے۔ پنجاب میں ایک نئی سیاسی پارٹی

امتیاز شاہ، قسور گردیزی اور شمیم اشرف ملک کے ساتھ مل کر بنائی۔ پانچ سالہ بن باس مکمل ہوا تو کراچی آ کر دوبارہ کالج میں داخلہ لیا۔ ڈاکٹری مکمل کی، پنجاب کے شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کیا، پشاور بھی گئے کچھ عرصہ وہاں ایک میڈیکل اسٹور پر بھی بیٹھنے لگے۔ پھر پتا چلا کہ جگر کے عارضے میں مبتلا ہو گئے ہیں اور کراچی کے سول ہسپتال میں داخل ہیں۔ بیماری نا قابل علاج ہو گئی تھی اس میں مبتلا رہ کر وصال کیا۔ ملک شیر افضل جیسا باعمل اور باکمال رہنما طالب علموں میں کوئی دوسرا پھر کبھی پیدا نہیں ہو گا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

دوستو! کیا المیہ ہے ہم لوگوں کے درمیان رابطوں کا کہ اپنے دوستوں اور محسنوں کی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعہ ملتی ہے۔ آج صبح کا اخبار ایسی ہی دل گداز اور اندوہناک خبر لیے ہوئے تھا۔ ایک بار تو یقین نہیں آ رہا تھا لیکن اختر سعیدی کی رپورٹ اور ڈاکٹر صاحب کی تصویر سامنے موجود تھی، تھوڑی دیر کے لیے میں گُم سُم سا ہو گیا۔ چند ہی دن پہلے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی میں نے اُنھیں اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا فیض کا پورٹریٹ پیش کیا جو گرے کاغذ پر چاک سے بنایا گیا تھا ڈاکٹر صاحب کو یہ پورٹریٹ بہت پسند آیا اور چاک کا استعمال اُن کے لیے حیرت کا باعث ہوا۔ کہنے لگے میں اسکے شکریہ ادا کرنے کے لیے تمہارے گھر آؤں گا اور اپنی کتاب بھی لیتا آؤں گا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا منتظر ہی رہ گیا۔

اب اُن سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔ موت ایک حقیقت ہے زندگی کی طرح لیکن بڑے لوگ مرا نہیں کرتے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے عہد کے واحد ترقی پسند نقاد تھے یہ بات میں بلاخوف تردید عرض کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ وہ نامور ادیب، مترجم، صحافی اور ماہر تعلیم تھے۔ نقد و نظر میں اُن کا شمار پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر ممتاز حسین کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن کے مطالعہ سے اُن کی ترقی پسندی صاف واقع ہو جاتی ہے۔ اُن کے مقالے پُرمغز ہونے کے علاوہ ادبی شہ پارے ہوا کرتے تھے۔ زبان اور بیان پر اُنھیں جو عبور تھا وہ کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

سہ ماہی ارتقا سے اُن کا تعلق بہت دیرینہ تھا اور اس رسالے کی تدوین و ترتیب میں

ڈاکٹر صاحب کا کردار بہت اہم تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اُنھوں نے اپنے ایک مقالے میں یہ انکشاف کیا تھا کہ معروف فلسفی کارل مارکس شاعر بھی تھا اور غزل کی صنف میں شاعری کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ذاتی طور پر بہت نفیس انسان تھے بہت حلیم الطبع جس سے ملتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے بہت پرانی شناسائی ہے۔ کپڑے پہننے کے معاملے میں بہت بے پرواہ تھے۔ بال بھی اُلجھے ہوئے ہوتے تھے بعد کو اِن سے بھی بے نیاز ہوگئے۔ میں نے کبھی اُنھیں سوٹ پہنے نہیں دیکھا۔ کراچی کی ادبی اور سماجی محافل ڈاکٹر صاحب کے بغیر بے رونق ہو جائیں گی۔

حصہ سوئم

اعز عزیزی......ایک تعارف

البیلے اعز

اب ذہن پر زور ڈالتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ اعز عزیزی سے پہلی ملاقات لگ بھگ ساٹھ برس قبل خیر پور میں ہوئی تھی۔ ان دنوں شاہی بازار خیر پور کے شاہ مراد میڈیکل سٹور کی چھت پر ڈاکٹر اعزاز نذیر اور ان کے بعض احباب قیام پذیر ہوا کرتے تھے، جن میں کراچی اور حیدرآباد کے بعض ٹریڈ یونین ورکرز، سیاسی کارکن اور محنت کش بھی شامل تھے۔ ان میں سے جس کسی کو کہیں کام کاج مل جاتا تو وہ اپنا الگ ٹھکانا بنا لیتا اور ممکن ہوتا تو ایک دو کو اپنے ساتھ بھی لے جاتا تھا۔ جانے والوں کی جگہ بے روزگاروں کی نئی کھیپ وارد ہو جاتی، جن کے لیے ایک بار پھر۔ کے۔ ٹی۔ ایم ماچس فیکٹری اور دوسرے صنعتی اداروں میں یورش شروع ہو جاتی تھی کہ ان دنوں اعزاز نذیر میڈیکل ریپ (Medical Rep) کی حیثیت سے خیر پور میں مقیم تھے اور عرف عام میں 'ڈاکٹر' کہلاتے تھے۔ یہاں ان کے اردگرد بعض نہایت اہم معتبر اور مؤثر لوگوں کا حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ ان دنوں خیر پور کی سیاسی فضا اور سماجی ماحول کے پیش نظر عام طور پر سرخے اُسے سندھ کا تلنگانہ کہنے لگے تھے۔ ریاست کے کئی شہروں اور قصبوں میں متعدد صنعتی ادارے، ملز اور فیکٹریاں قائم تھیں جن میں خیر پور ٹیکسٹائل ملز، خیر پور ماچس فیکٹری، سلک ملز، بنارسی کپڑے کے کارخانے اور ریشم و سوتی دھاگوں کے کرگھے، پھیلے ہوئے تھے، جہاں اکثر تربیت یافتہ مزدوروں اور ہنرمندوں کی ضرورت رہا کرتی تھی۔ اُدھر کراچی اور حیدرآباد میں اکثر ٹریڈ یونین سرگرمیوں اور دیگر وجوہ کی بنا پر چھانٹیوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور لوگ بے روزگاری کا شکار ہو کر خیر پور کا رخ کیا کرتے تھے، جہاں ڈاکٹر اعزاز نذیر مرجع خلائق بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے

ڈھابے کے علاوہ تلاش معاش میں سرگرداں لوگوں کے لیے کئی دوسرے ٹھکانے بھی بنادیے گئے تھے۔ جن کے دم سے شہر میں ٹریڈ یونین سرگرمیاں دکھائی دینے لگی تھی، مزدور آفس پبلک ریڈنگ روم۔ عوامی پکار مرکز وغیرہ کے علاوہ چائے خانوں میں بھی عوامی چہل پہل دکھائی دیتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ پہلے پہلے ہتھوڑے اور درانتی والا سرخ پرچم بھی یہیں کے ٹریڈ یونین آفس پر لہراتے دیکھا تھا۔ ون یونٹ کے قیام کے نتیجے میں ریاست کا سیاسی، دفتری اور انتظامی وجود ختم ہو چکا تھا۔ لیکن سماجی سطح پر پرانے ماحول کے اثرات ہنوز باقی تھے۔ شہر کے سیاسی اور سماجی منظرنامے پر سیّد میر علی مردان تالپور، سیّد علی مطاہر جعفری، سیّد پیکر نقوی، سیّد باقر علی شاہ، سیّد پناہ علی شاہ وغیرہ کے نام نمایاں تھے۔ جن میں سے اکثر بائیں بازوں کی سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ اعزاز نظر کی آمد اور قیام نے اس حلقے کے دائرہ اثر کو مزید پھیلا دیا تھا۔ وہ بہ ظاہر میڈیکل ریپ کی حیثیت سے چمڑے کا مخصوص بیگ اُٹھائے، کوٹ، ٹائی اور کالی عینک پہنے ڈاکٹروں کے مطب کے چکر لگاتے پھرتے تھے۔ خیرپور، سکھر، شکارپور، لاڑکانہ، جیکب آباد، پنوعاقل، گھوٹکی اور روہڑی وغیرہ ان کی رینج میں تھے، یہ بات تو ایک مدت بعد معلوم ہوئی کہ یہ حضرت صرف دوائیوں کے نمونے اور لٹریچر لے کر در بدر نہیں پھرا کرتے ہیں بلکہ ان کا اصل کام بالائی سندھ میں بائیں بازو کی سوشلسٹ تنظیموں کی سرگرمیوں کو منظم کرنا تھا۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اس وقت تو ذکر ہے۔ اعز عزیزی سے ہماری پہلی ملاقات کا۔

دیکھنے میں اعز کا ڈیل ڈول ہم سے کچھ ایسا مختلف نہیں تھا۔ ویسے ہی سنگل پسلی کے آدمی تھے جیسے ہم تھے۔ چہرا مہرا بھی ویسا ہی چھریرا تھا۔ البتہ قد ہم سے کچھ نکلتا ہوا۔ جس کی وجہ سے پتلی پتلی ٹانگیں زیادہ لمبی اور گردن زیادہ صراحی دار لگنے لگی تھی، رنگ گندمی بلکہ کھلتا ہوا گندمی اور بڑے بھائی کے مقابلے میں اچھا خاصا گورا چٹا تھا۔ سر پر سیاہ گھنگریالے بالوں کی خوبصورت ٹوکری، جس کی دو چار لٹیں گردن پر بھی جھولتی تھیں۔ کنپٹیوں پے گھنی سیاہ لمبی اور چوڑی قلمیں جوان دنوں نوجوانوں میں مقبول تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا رواں کچھ زیادہ تو نہ بھرا تھا۔ لیکن راج کپور طرز کی مونچھیں تراشنے کی کوشش نمایاں تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ انھوں نے بھی نیلے رنگ کی کواڈرائے کا پتلون، سفید قمیض، اور چیک کا گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں مفلر کا خاص اہتمام تھا۔ غرض حلیے میں ہر طرح سے درست، ٹپ ٹاپ صفائی اور فیشن کا رکھ رکھاؤ خاص طور پر محسوس ہو

جاتا تھا۔ کمرے میں ادھر اُدھر کپڑوں اور اخباروں کے ڈھیر لگے تھے۔ اور لگتا تھا کہ انھیں سلیقے سے اُٹھا کر رکھنے کی کسی نے زحمت نہ کی تھی۔ لیکن ان کے اپنے کپڑے تھے کہ سلیقے سے کھونٹوں پر اس طرح ٹانگے گئے تھے کہ نہ پتلون کی کریز ٹوٹنے پائے اور قمیض کے کالر پے کھونٹی کے نشان کا گومڑا اُبھر سکے اور نہ سوتی شیروانی میں جھل آئے۔ صبح دس گیارہ بجے کا وقت تھا اور سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر چائے پی رہے تھے۔ کسی نے گلاس میں چائے انڈیل رکھی تھی، کسی کو مگ ہاتھ لگا تھا اور کوئی بغیر ڈنڈی کے کپ سے استفادہ کر رہا تھا، ایک صاف ستھرا اور قدرے سلامت کپ ساسر پر یہ حضرت پہلے ہی قبضہ جمائے بیٹھے تھے اور منتظر تھے کہ کوئی مائی کا لال ان کے صاف ستھرے کپ میں بھی گرم چائے چھان دے تو یہ بھی اسے پی ڈالیں۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے ان لوگوں کی چہلوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ ہمیں دراصل خیر پور کے انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں کچھ کام تھے۔ چنانچہ وہاں جانے سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا کہ ہم اپنے کام سے فارغ ہو کر وہیں واپس آ جائیں تو یہاں سے کھانا وانا کھا کر وہ اور اعز بھی ہمارے ساتھ ہی بس سے سکھر چلیں گے، سو ویسا ہی ہوا۔ اس وقت اعز کوئی ہفتہ بھر سکھر میں رہے تھے۔ فتح اللہ عثمانی صاحب کی بیٹھک اور لائبریری کا ایک جزوی مصرف یہ بھی ہوا کرتا تھا کہ اکثر کامریڈ حضرات یہاں قیام کر لیتے تھے۔ حق مغفرت کرے عثمانی صاحب کی بیگم صاحبہ اور ہم سب کی بھابھی غیر معمولی متواضع خاتون تھیں، خاص طور پر حیدر آبادیوں کا بہت خیال رکھا کرتی تھیں۔ چنانچہ اکثر اعزاز نذیر آتے جاتے یہاں ٹھہر جاتے تھے۔ حالانکہ بھابھی اُن کے پھوہڑ پن سے عموماً سخت بے زار رہا کرتی تھیں۔ لیکن جب واسطہ اعز سے پڑا تو وہ ان کی نفاست پسندی سے بہت متاثر ہوئیں۔ سگریٹ تو سب ہی پیتے ہیں، ہم نے بھی کم عمری میں ہی سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی لیکن اعز کے مقابلے میں ہماری کوئی حیثیت نہ تھی کہ ان کا شمار اس وقت بھی باقاعدہ سگریٹ نوشوں میں ہوتا تھا لیکن وہ اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ سگریٹ کی راکھ ادھر اُدھر نہ بکھر سکے، اور ٹوٹے فرش پر نہ پھینکے جائیں چنانچہ ایش ٹرے کے استعمال کا خاص خیال رکھتے تھے۔ یہی بات بھابھی کو پسند آتی تھی۔ گیلے تولیے کو یونہی چھور دینے کی بجائے وہ باقاعدہ ہوا میں پھیلا کر ڈالتے تھے گویا مزاج میں سگھڑاپے اور ترتیب ونظم کی عناصر نمایاں تھے۔

شروع شروع میں لگا کہ یہ خاموش طبع اور اپنے آپ میں رہنے والے آدمی ہیں لیکن دو

چار ملاقاتوں ہی میں کھلا کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ بے تکلف دوستوں کی محفل میں خوب خوب چہکتے ہیں۔ موضوع اگر سیاسی اور بالخصوص انقلابی ہوتو ان کی گل افشانی گفتار اور جوش دیدنی ہوتا ہے۔ گفتگو میں پارٹی، مارکس، لینن اور ماؤ، وغیرہ کے حوالے اور کمیونسٹ اصطلاحوں کے استعمال سے بھی ہم خاصے مرعوب ہوئے تھے کہ اس وقت تک ہمیں طالب علمی کی ہمک ہی سے باہر نکلنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی ہماری عمومی دلچسپی ترقی پسند ادب اور سٹوڈنٹس سرگرمیوں کے دائرے میں محیط تھی، انقلابی باتیں اور مارکسی بوطیقا سے ویسا سابقہ نہ پڑا تھا جیسا کہ اعز کی باتوں میں اس وقت بھی جھلکتا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ بھی اس گروہ کے اہم رکن ہیں جو کھلی آنکھوں انقلاب کے خواب دیکھتے ہیں اور انقلاب کے ذکر پر ان کی آنکھوں میں چمک اور لہجے میں سرخوشی پیدا ہو جاتی تھی۔ جیسے انقلاب باہر گلی میں کھڑا دستک دے رہا ہو! بس یہ اُٹھ کر دروازے کی زنجیر کھول دیں گے اور انقلاب کی سواری چھم سے اندر داخل ہو جائے گی۔

انقلاب سے ان لوگوں کا لگاؤ کوئی ایسا بے سبب بھی نہیں تھا کہ کراچی میں یہ حضرت نوعمری ہی سے عملی طور پر ٹریڈ یونین گرمیوں میں مصروف رہے تھے۔ لانڈھی، ملیر وغیرہ کے مختلف اداروں میں ٹریڈ یونین تنظیمیں قائم کرنا، محنت کشوں کے عمومی مسائل کا شعور حاصل کرنا اور لوگوں کو ان کے حل کے لیے متحرک کرنا کوئی چھوٹے موٹے کام نہ تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے تنظیمی امور میں بھی وہ کسی نہ کسی سطح پہ شامل رہتے تھے اور جب پارٹی نے سندھ کے دیہی علاقوں میں تنظیمی سرگرمیاں شروع کی تو یہ بھی اس مہم کا حصہ تھے۔ ہمیں اس زمانے کی ایک کسان کانفرنس اب تک یاد آتی ہے جو نواب شاہ کے قریب ایک گاؤں 'سرہاری' میں 1956ء یا 1957ء میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں ہم اعزاز نظیر، فتح اللہ عثمانی، حسن حمیدی اور رکن الدین قاسمی وغیرہ کے لشکر کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ ہمارے گروپ میں پنوعاقل، گھوٹکی، جیکب آباد، اور خیر پور وغیرہ کے درجنوں دوسرے احباب بھی شامل تھے۔ کچھ لوگ ٹرین سے پہنچے تھے اور کچھ بسوں میں آئے تھے۔ ریلوے سٹیشن پر سرخ پرچم کے ساتھ استقبال کرنے والوں میں اعز بھی شامل تھے۔ گیروے کھدر کے کرتا پاجامے اور کھدر ہی کی واسکٹ، سر پر ماؤ کیپ سجی ہوئی تھی اور گلے میں اجرک کا پٹکا سا ڈال رکھا تھا، لیڈرانہ سج دھج میں کوئی کمی نہ تھی۔ اس دوروزہ کانفرنس میں بہت سے لوگوں سے تعلقات قائم ہوئے تھے۔ جن میں سے اکثر مراسم اب بھی چلے جاتے ہیں۔ اعز سے وہاں بھی

کھل کر ملاقات نہ ہو سکی تھی کہ وہ انتظامی معاملات میں بے حد مصروف دکھائی دیتے تھے۔ ان کی یہ مصروفیت ہمارے لیے تو باعث رشک ہی تھی کہ کبھی کانفرنس کے لیے ریزولیشن ڈرافٹ کمیٹی میں بیٹھے ہوتے تھے۔ کبھی جلسے جلوسوں کے انتظامات میں منہمک دکھائی دیتے۔ اس ماحول اور پس منظر میں آدمی انقلاب کے گہرے سرخ بادلوں پہ سوار اُڑتا نہ پھرے تو بھلا کیا کرے!!

اعز کے انقلابی ہونے کا بنیادی سبب تو بڑے بھائی ڈاکٹر اعزاز نذیر ہی تھے۔ ورنہ ان کا خاندانی ماحول سیدھے سادھے متوسط مسلم گھرانے کا تھا، جس میں مذہبی اثرات بھی نمایاں تھے کہ ان کے والد گرامی عزیز الدین احمد شاہ صوفی ابواحمد صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت عبداللہ شاہ صوفی کے سجادہ نشینوں سے ملتا تھا۔ آس پاس پیری مریدی اور صوفیانہ طور طریقے رائج تھے۔ لیکن خاندان میں ان کے والد غالباً پہلے آدمی تھے جنھوں نے اپنی روشن خیالی کے سبب پیرزادگی اور منفعت بخش سجادہ نشینی ترک کر کے عام لوگوں کے طور پر زندگی گزارنے کو ترجیح دی تھی اور آصف جاہی نظام حکومت میں نائب تحصیل دار مقرر ہوئے تھے۔ جو ریاست حیدرآباد کے نظام میں ایک معتبر اور اعلیٰ عہدہ شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ معاشی اعتبار سے دیکھیے تو انھیں تونگری نہیں تو فارغ البالی ضرور حاصل رہی ہوگی۔ مگر ترک وطن کر کے جب وہ پاکستان آئے تو انھیں بھی زندگی گزارنے کے لیے ویسی ہی تلخ کامیوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے کم و بیش سب مہاجروں کو گزرنا پڑ رہا تھا۔ وہ بھی عجب وقت تھا۔ بے زمین و بے آسماں لوگوں کے قافلے، سروں پر مصائب، ادبار اور ضرورتوں کی بھاری گٹھڑیاں لادے چلے آتے تھے۔ سب ہی کو سر چھپانے کے لیے ٹھنڈی چھاؤں، اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے نان جویں کے دو لقموں کی تلاش تھی، مقامی آبادی اور نوزائیدہ حکومتی اداروں کے بس میں جو کچھ ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ بہر صورت سرانجام دیے جا رہے تھے۔ ایسے لوگ تو یقیناً بہت خوش نصیب تھے۔ جنھیں تھوڑی سی تگ و دو کے بعد کوئی نہ کوئی ملازمت، وسیلہ اور ٹھکانہ دستیاب ہو گیا ہو اور مصائب کے اس بحر بے کنار میں انھوں نے کسی کھونٹے کو مضبوطی سے تھام لیا ہو یا منجدھار کے بیچوں بیچ جنھیں ہمدرد ہاتھوں نے سہارا لیا ہو۔ اعز کے والد صوفی عزیز الدین صاحب کا شمار بھی ایسے ہی خوش نصیبوں میں کیا جانا چاہیے کہ انھیں بھی ابتدائی چند ماہ کی بے روزگاری کا چسکا چکھنے کے بعد ہی ایک پرائیویٹ فرم کے دفتر میں معقول سی ملازمت مل گئی تھی۔ جو بھرے پرے کنبے کے حلق کو تر رکھنے کے لیے از حد ضروری تھی۔ اس معاملے

کا سب سے قابلِ اطمینان پہلو تو یہ تھا کہ ملازمت کے ساتھ ایک چھوٹا سا نوتعمیر کوارٹر بھی دستیاب ہو گیا تھا جو ناظم آباد نمبر ایک کی چورنگی پر واقع بس سٹینڈ سے منسلک تھا۔ اور ان کے بڑے داماد کو الاٹ ہوا تھا۔

ہم نے صوفی صاحب کو پہلے پہلے (غالباً 1959ء) میں یہیں دیکھا تھا جب وہ عمر کی ڈھلوان کے ساتھ اُتر رہے تھے۔ ڈیل ڈول سے پتہ چلتا تھا کہ کبھی وہ اچھے خاصے قد آور مضبوط جثّے کے آدمی رہے ہوں گے۔ لیکن اب آثار بتا رہے تھے کہ جسم کی عمارت میں رست و خیز کے جھکڑ سہنے کا حوصلہ نہیں رہا ہے، اور وقت کا تقاضا یہی تھا کہ دونوں بیٹوں کو مل جل کر خاندان کی کشتی کے پتوار اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔

اعزاز تو پہلے ہی خود کو مزدور تحریک اور بائیں بازو کی سیاست کے حوالے کر چکے تھے اور انھیں آئے دن پکڑ دھکڑ کے مسائل بھی درپیش رہا کرتے تھے۔ چنانچہ خاندان کی مکمل کفالت کے لیے ان پہ مکمل طور پر انحصار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں اعز کو نوعمری ہی میں فکرِ معاش کی تگ و دو میں کودنا پڑا تھا۔ شروع شروع میں تو بڑے بھائی کی تقلید میں وہ بھی کراچی اور حیدر آباد کی ٹریڈ یونینوں اور مزدور تحریکوں میں عملی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ فیکٹریوں، ملوں اور کارخانوں کی خاک چھانتے۔ بھاگ دوڑ کے نتیجے میں چھوٹی موٹی نوکری کہیں نہ کہیں مل ہی جاتی تھی لیکن سیاسی مشاغل کے طفیل کسی نوکری کی چار چھ ماہ سے زیادہ طوالت مشکل ہی سے ہو پاتی تھی اور ہر چند ماہ بعد نئی ملازمت تلاش کرنی پڑتی تھی شاید اس وقت کسی ایک شعبے اور مقام پر ٹک کر بیٹھنے اور یکسوی کے ساتھ مستقل زندگی کا لائحہ عمل بنانے کا طے ہی نہ ہو پایا تھا دراصل وہ اس وقت تک سیاسی چہل پہل میں شراکت داری کے عمل ہی کو مقدم تصور کرتے تھے۔ جذباتی اُبال تھا کہ انھیں کہیں ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ لیکن کب تک؟ والد کی علالت کے باعث آخر کار دونوں بھائیوں کو سنجیدگی سے فیصلہ کرنا پڑا کہ ان میں سے کسی ایک کو فوری طور پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سیدھے سبھاؤ کراچی ہی کو مستقل ٹھکانہ بنانا ہو گا اور کل وقتی طور پر کوئی اچھی سی ملازمت اختیار کرنی پڑے گی، تاکہ لمبے چوڑے گھرانے کی مشین کو حسبِ معمول جاری رکھا جا سکے، جہاں تک اعزاز کا تعلق تھا یہ بات سب جانتے تھے کہ وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں میں بہت آگے تک جا چکے تھے۔ سندھ کے متعدد شہروں اور دیہی علاقوں میں تنظیمی سرگرمیوں کا ایک جال بنایا جا چکا تھا، جس کے تانے بانے کسی نہ

کسی انداز میں اعزاز ہی سے بندھے ہوئے تھے، چنانچہ ان کے لیے کراچی کیا بلکہ کسی بھی ایک جگہ کو مستقل مستقر بنانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اب ان کی زندگی کے معمولات پارٹی فیصلوں کے پابند ہو چکے تھے۔ اعز خود بھی بڑے بھائی کی سیاسی اور نظریاتی سرگرمیوں کی اہمیت اور پھیلاؤ سے خوب اچھی طرح آگاہ تھے اور انھیں بھی ان کی سرگرمیوں میں کسی قسم کی رخنہ اندازی پسند نہ تھی۔ چنانچہ اعز کو رضا کارانہ طور پر خاندان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرنی پڑی تھی۔ عزاز اس معاملہ میں جس حد تک شریک رہا کرتے تھے وہ عمل بدستور جاری رہا۔ اس پس منظر میں اعز کو اندرون سندھ کی سرگرمیاں ترک کر کے کراچی میں مستقل قیام کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا تھا کہ ضعیف والد کو کم از کم ان کی علالت کے دوران تو ملازمت کے کھیکڑ سے محفوظ رکھا جا سکے۔

ملازمت کے تعلق سے اعز نے رفتہ رفتہ مارکیٹنگ کے شعبے میں خود کو مستحکم کرنا شروع کر دیا تھا اور تجربے نے بتایا کہ یہی شعبہ دراصل ان کے سیلانی مزاج اور عوامی رابطے کی خداداد صلاحیت کے عین مطابق تھا کہ کسی دفتر کی میز، کرسی یا کسی مل میں مشین کے سامنے صبح سے شام تک خون پسینہ بہانے سے کہیں بہتر تھا کہ مخصوص علاقے کے ڈیلرز کے درمیان چکر لگایا جاتا رہے اور منتخب پروڈکٹس کے لیے مناسب ڈیلر تلاش کیے جائیں۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے ملا جائے اور ہر اک سے اس کے مزاج اور طبیعت کی روشنی میں رسم و راہ بڑھائی جائے۔ یہ محض ایک رسمی کاروباری مصروفیت نہیں تھی بلکہ زندگی کے اصل حقائق کو روزانہ کی بنیاد پر برتنے اور سمجھنے کا معاملہ بھی تھا، جس میں لوگوں کی نفسیاتی ضرورت اور تیزی سے بدلتے ہوئے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا تھا۔ یہاں روز نیا کنواں کھودنا پڑتا تھا اور نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اعز نے ابتداء ہی میں مارکیٹنگ کے عمل کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا چنانچہ چند برسوں کی تگ و تاز کے بعد تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے ایک مشہور سگریٹ کمپنی کے سیلز ڈپارٹمنٹ سے ایسے مستحکم تعلقات قائم کر لیے تھے کہ باقی زندگی یعنی کم و بیش تیس 30 بتیس 32 سال اسی کمپنی کی رفاقت میں گزار دیے، حالانکہ حریف کمپنیاں اب بھی بہتر سے بہتر پیشکش لیے حاضر رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ وابستگی قائم کرنے کے بعد ادھر ادھر دیکھنا اعز کی سرشت ہی میں شامل نہ تھا۔ وہ وفاداری بشرط استواری کے قائل تھے۔ اس شعبہ میں رہ کر کاروباری دائرہ کار کے ساتھ ساتھ سیاسی اور نظریاتی چلت پھرت کے دائرے بھی پھیلتے گئے تھے اور سنا ہے کہ اس زمانے میں

بھی وہ بعض سنجیدہ نوعیت کے کام بھی چلتے پھرتے کرلیا کرتے تھے۔ مثلاً بہت دنوں تک حسن ناصر کے رابطہ کار اور کوریئر جیسی اہم ذمہ داری بھی ادا کی تھی۔ جو اپنی نوعیت اہمیت اور حساسیت کے اعتبار سے نہایت نازک اور خطرناک کام تھا کہ اس میں نہ صرف آپ کو اپنی ذات کے خول سے نکل کر شدید قسم کے ڈسپلن کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ راز داری کی بھاری صلیب اُٹھا کر اعتبار کے پل صراط کا سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ خیال وعمل کی ایسی میکانکیت پیدا کرنا ہوتی ہے، جہاں معمولی قسم کے تساہل اور بھول چوک کی بھی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس ذمہ داری کو قبول کر کے آپ ایک شخص ہی نہیں بلکہ ایک تنظیمی سیٹ اپ کی سلامتی کی ذمہ داری قبول کر لیتے ہیں۔ حسن ناصر کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ وہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے بنیادی اراکین میں شامل تھے اور جنھیں قیام پاکستان کے بعد کراچی اور سندھ میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل تنظیم کی اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ حیدرآباد میں مخدوم محی الدین، ڈاکٹر راج بہار گوڑ اور، علی جواد رضوی وغیرہ کے ساتھ کام کر چکے تھے اور بمبئی میں ڈاکٹر ادھیکاری کی روپوشی کے زمانے میں ان کے کوریئر رہ چکے تھے۔

چنانچہ جب حسن ناصر نے انھیں اپنا رابطہ کار بنانے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے بجا طور پر اسے اپنے لیے باعث افتخار و اعزاز سمجھا تھا اور جب تک وہ اس ذمہ داری سے منسلک رہے، ان کی اپنی زندگی کے معمولات یکسر تبدیل ہو کر رہ گئے تھے۔ اب ان کے سارے مشاغل ایک مخصوص دائرہ کار کے اسیر تھے۔ جہاں انھیں ناصر جیسے معروف اور فعال شخص کے سخت ڈسپلن کا تابع ہونا تھا۔ بے شک وہ دور انتہائی اہم سرگرمیوں کا دور تھا۔ جس میں ہر کام لگے بندھے ضابطوں کا مرہونِ منت تھا۔ راز داری کی ذمہ داری بجائے خود بھاری چٹان ہوتی ہے جسے سہارنا ہر ایک کے بس میں نہیں ہوا کرتا۔ اعز نے غالباً ڈیڑھ دو برس اس اہم ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔ لیکن جب حسن ناصر اپنی ہی غیر معمولی خود اعتمادی کی وجہ سے گرفتار ہوئے تو پاکستان کے مختلف شہروں بالخصوص کراچی وحیدرآباد سے درجنوں سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا گیا تھا، ان میں اعز کا نام سرفہرست تھا۔ یہ ان کی پہلی اسیری تھی جو سب سے زیادہ طویل بلکہ شدید قسم کے تشدد کی حامل بھی تھی۔ یوں تو حسن ناصر کی شہادت پر بائیں بازو کے سب ہی کارکنوں اور ہمدردوں کے دل غم واندوہ سے لبریز تھے لیکن اعز جیسے لوگوں نے جنھیں ان کے ساتھ شریک عمل ہونے کے مواقع ملے تھے اس واقعہ کو ہمیشہ ذاتی المیہ ہی سمجھا تھا۔ اور یہ غم زندگی بھر ان کے ساتھ رہا۔

1959ء کے اواخر میں میری بہن تنویر فاطمہ سے ڈاکٹر اعزاز نذیر کی شادی ہو چکی تھی۔ اس زمانے میں اعزا اپنے والدین اور بہنوں وغیرہ کے ساتھ کئی مہینے خیر پور اور سکھر میں رہے تھے، اعزاز کے تصرف میں تو میڈیکل سٹور پر واقع ڈیڑھ کمرے پر مشتمل ڈھابہ ہی تھا۔ جس میں سب لوگوں کا گزارا ممکن نہ تھا، چنانچہ قریب ہی عارضی طور پر ایک اور رہائش کا اہتمام کر لیا گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس طرح کے عارضی انتظامات کے اپنے مسائل ہوا کرتے ہیں۔ بعض اوقات گھر گرہستی کے سامان اور مکمل فرنیچر کی عدم دستیابی تکلیف کا باعث تو ہوتی ہی ہے، ایسی صورت حال تو بس مسافر خانے کی سی ہوتی ہے جس میں کسی نہ کسی طرح گزارا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن محض گزارا کرنے والی صورت حال اعز کو بھلا کب پسند آتی ہے، وہ تو اپنے مخصوص سٹائل میں رہنے سہنے کی عادی تھے۔ جس میں کسی قسم کی کسر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ سنا ہے اس مسئلہ پر آئے دن دونوں بھائیوں میں کوئی نہ کوئی کھٹ پٹ رہا کرتی تھی، لہٰذا عارضی طور پر اعز کے لیے کسی اور دوست کے ساتھ جداگانہ بندوبست کرنا پڑا مگر یہاں ذرا دوسری قسم کی شکایات کا سامنا تھا، یعنی ان کے نزدیک میزبان قطعاً گھامڑ تھا کہ آرٹس، موسیقی اور کمیونزم کی بابت وہ سب کچھ نہ جانتا تھا جو ان حضرت کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ جو آدمی ان کے معیار پر پورا نہ اُترتا ہو بھلا اس کی میزبانی کب قبول ہو سکتی تھی۔ اس طرح کے معاملات میں وہ نہ تو ظاہر داری کے قائل تھے اور نہ رسمی معاملہ فہمی کے، جس کی وجہ سے عام لوگوں کے ساتھ برتاؤ میں اکثر اُلجھنیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ مگر جہاں ان کا جی لگ جاتا تھا وہاں ہر چیز قابل قبول بھی ہو جاتی تھی۔ اور تنگ مزاجی خوش دلانہ رواداری میں بدل جاتی تھی۔

اعز کی طبیعت میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت کا شدید احساس ہوتا تھا۔ کبھی کبھی لوگوں سے برتاؤ میں کھردرا پن جھلکنے لگتا تھا۔ جس کی اُن جیسے ملائم اور آرٹسٹ شخص سے توقع ہی نہیں کی جا سکتی مگر کبھی پھکڑ پن کی حد تک نرم خو، خوش مزاج اور ملنسار دکھائی دیتے۔ جی چاہتا تو وہ آپ کی بڑی سے بڑی غلطی کو بھی برداشت کر لیتے لیکن کبھی معمولی سی بات پر بھی قطع تعلق تک سے گریز نہ کرتے۔ دل میں میل رکھنے اور ظاہر داری برتنے کے وہ ہرگز قائل نہ تھے۔ ویسے بھی اعز بہت زیادہ گھلنے ملنے والے آدمی نہ تھے۔ یعنی پبلک ریلشنگ میں مہارت رکھنے کے باوجود ان کے اپنے ذاتی دوستوں کا حلقہ ہمیشہ محدود ہی رہا۔ اس معاملہ میں ذاتی پسند اور ناپسند کا بہت کڑا معیار قائم کر رکھا تھا۔ لیکن لوگ خود ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اس کی کبھی پرواہ نہ کی۔ اعزاز اکثر اس طرح کی باتوں پر ٹوک دیا کرتے تھے جو ہمیشہ فتنہ فساد کا سبب بن جاتا تھا۔ دونوں بھائیوں

کے درمیان پیار و محبت کا ایسا اٹوٹ رشتہ قائم تھا جس میں زلزلے کی ہلکی پھلکی لہریں بھی اُٹھتی رہتی تھیں۔ اعزاز کو چینخم دھاڑ کرنے کی عادت تھی۔ جو ابن اعز چیزوں کو توڑ پھوڑ پر اُتر آتے تھے۔ دراصل ان کے لیے اعزاز محض بڑے بھائی ہی نہیں تھے بلکہ ایک آئیڈیل دوست کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ اعز نے عملاً ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی بلکہ سیاسی سرگرمیوں میں خود اپنا قد کاٹھ بھی نکالا تھا لیکن اعزاز انہیں برادر خورد سے زیادہ اہمیت نہ دیتے جس کی وجہ سے کبھی کبھی شدید تناؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ خیر گھڑی دو گھڑی کی کھٹا پٹی کے بعد معاملات نارمل ہو جایا کرتے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ ہی نہ سکتے تھے۔ اعز بھائی سے لاڈ پیار کی توقع رکھتے تھے لیکن کسی قسم کی حاکمیت اور بزرگی کے روادار بھی نہ تھے۔

سن ساٹھ کی دہائی میں وہ کچھ عرصہ سے سکھر میں رہے۔ اس قیام کے دوران ان کی شخصیت اور مزاج کے بعض مزید دلچسپ پہلو سامنے آئے اور لگا کہ بظاہر اس کھردرے آدمی کی تار و پود میں تو سراسر ریشم کی نرم و نازک لچھیاں استعمال ہوئی ہیں۔ ہم تو انھیں محض ٹریڈ یونین ورکرز اور سیاسی آدمی ہی سمجھتے تھے لیکن، کھلا کہ ان کی سرشت میں تو رنگا رنگ دھنک پھیلی ہوئی ہے۔ اور وہ فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں میں جنون کی حد تک دلچسپی رکھتے ہیں۔ کلاسیکل اور جدید مصوری سے انھیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ لکیروں، خطوں، دائروں اور قوسوں کے درمیان فن کارانہ تناسب کا شعور اور رنگوں کی معنویت کا جیسا علم وہ رکھتے تھے ہمارے لیے تو حیران کن ہی تھا۔ ہر چند اس وقت تک ان کی بنائی ہوئی کوئی پینٹنگ ہماری نظر سے نہیں گزری تھی لیکن پنسل اور کوئلے سے بنے ہوئے سکیچ انھوں نے کئی دوستوں میں بانٹے تھے۔ جن کو دیکھ کر فن کارانہ پختگی کا احساس ہوتا تھا۔ سنگ تراشی، پاسٹر آف پیرس، چاک اور مٹی سے مورتیاں اور سٹیچو بنانے کے فن میں بھی خاصی رغبت تھی۔ چنانچہ سکھر میں پتھر تراشنے والوں کے محلے کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ اور گھنٹوں کسی دوکان کے باہر کھڑے ہو کر سنگ تراشی کا ہنر دیکھتے اور معقول داد بھی دیا کرتا تھے۔ سنگین مورتیوں کے شوق نے تو انھیں سادھو بیلہ کے مندر کا پجاری سا بنا دیا تھا۔ سکھر کا یہ تاریخی مندر دریائے سندھ کے بیچوں بیچ ایک قدیم ٹاپو پر بنایا گیا ہے۔ جو تقریباً ایک ڈیڑھ میل کے دائرے میں پھیلا ہوا ہے۔ اتنا بڑا چٹانی جزیرہ دریائے سندھ کے بیچوں بیچ کوئی دوسرا موجود نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی کسی اور دریا کے درمیان بھی شاید ایسا وسیع ٹاپو موجود نہ ہو۔ اس جزیرے پر ہندو دھرم سے وابستہ مختلف اوتاروں سے موسوم متعدد پختہ مندر استھان بنائے گئے ہیں۔ جن میں چھوٹی بڑی سینکڑوں

مورتیاں رکھی گئی ہیں۔ ان میں سے اکثر مورتیاں سٹیچو اور سنگ تراشی اور فن کاری کے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مرکزی ہال اور لائبیری کی دیواروں پر مہابھارت اور رامائن کی کتھائیں اور ہندو دیو مالائی کہانیاں سفید سنگ مرمر میں سلسلہ وار کندہ کی گئی ہیں۔ چنانچہ سادھو بیلہ صرف ایک مذہبی وثقافتی مرکز ہی نہیں ہے بلکہ سنگ تراشی اور مصوری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی خاص کشش رکھتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سادھو بیلے کے مندر، ثقافتی مرکز اور منسلک باغات کو اقلیتوں کی وزارت کے تحت قائم ایک ٹرسٹ کے زیر نگرانی دے دیا گیا ہے اور عام لوگوں کے لیے اس میں داخلہ ممنوع ہے، البتہ سال میں ایک مرتبہ چند روز پر مشتمل مذہبی میلہ ضرور منعقد ہوتا ہے۔ جس میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ دوسرے کئی ممالک سے ہندو یاتری شریک ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے سادھو بیلہ پروجیکٹ دیکھنے کے لیے خصوصی اجازت نامے ڈپٹی کمشنر سکھر جاری کیا کرتا تھا جس کے لیے بہت سخت شرائط رکھی جاتی تھیں چنانچہ دلچسپی رکھنے والوں کو بہت بھاگ دوڑ کے بعد کبھی کبھار ہی وہاں جانے کی اجازت ملا کرتی تھی۔ لیکن بعض کشتی والے چوری چھپے رقم لے کر وہاں پہنچا دیا کرتے تھے جو یقیناً ایک خطرناک اقدام ہوتا تھا۔ کیونکہ وہاں شب بسری کا کوئی معقول انتظام موجود نہ تھا اور دن میں بھی چوکیدار پکڑ کر پولیس کے حوالے کر سکتے تھے۔ یہ بھی شنید تھی کہ ملحقہ جنگل میں سانپ اور دوسرے موذی حشرات بھی بہت ہیں اس لیے لوگ بھی عموماً کسی قسم کی معرکہ آرائی سے گریز کیا کرتے تھے۔ لیکن اعز صاحب کے ذوق فراواں کا عالم یہ تھا کہ وہ ہر دو چار ہفتے میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچنے کی سبیل نکال لیتے تھے اور وہاں سے نقشین چربے اتار لاتے تھے۔ جو ان کے ذخیرے میں شامل ہو جاتے اور جن میں سے بعض کی نقلیں بنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ لیکن اس فن میں جس قدر تن دہی، سپردگی، محنت، ڈیڈیکیشن اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خواہش کے باوجود انہیں میسر نہ ہو پاتی تھی۔

انھیں پرانی کتابوں، رسالوں، کلینڈروں اور فن پاروں کو تلاش اور حاصل کرنے کا بھی جنون رہا ہے۔ اور ان کے پاس قدیم کتابوں رسالوں اور فن پاروں پر مشتمل اچھا خاصا قیمتی ذخیرہ تھا۔ نوادارات جمع کرنے کا شوق کم وبیش پوری زندگی ہی قائم رہا لیکن اس میں بھی اُتار چڑھاؤ کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی تھی۔ اسی طرح پرانے سکوں کا نہایت وسیع اور قیمتی خزانہ بھی جمع ہو گیا تھا ان کے پاس مشکل دور کے بھی چند سکے موجود تھے۔ رنگین، قیمتی پتھر، ہیرے، نگینے، اور موتیوں کی تلاش میں بھی اکثر سرگرداں رہا کرتے تھے۔ اور اس مشکل شعبے میں بھی غیر معمولی کامیابی حاصل

کی تھی۔ کوڑیوں گھونگھے اور سیپیوں کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے سمندر کی تہہ سے نکلی ہوئی چھوٹی بڑی سیپیوں کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ جن میں چند سیپیاں ایک ایک فٹ لمبی بھی تھیں، اسی طرح کے اور بھی شوق ان کے ہاں اکثر و بیشتر پیدا ہوتے رہتے تھے۔ مثلاً بانسریاں اور پرانے چراغوں کے نمونے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا تو اس میں بھی تلاش و جستجو جاری رکھی۔ پرانے گیتوں کے ریکارڈ ڈھونڈتے پھرتے تھے پنکج ملک، وغیرہ ان کے پسندیدہ یونیفارم تھے۔

جیسا کہ عرض کیا ہے مذکورہ بالا شوق اور دلچسپیاں سدا ایک سطح پر قائم نہیں رہا کرتی تھیں بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے گراف تیزی کے ساتھ نیچے اوپر ہوتے رہتے تھے۔ آخر میں بعض دلچسپیاں یکسر معدوم بھی ہوگئیں تھیں۔ دراصل وہ زندگی بھر کسی ایک دائرے میں گھومتے رہنے کے قائل نہ تھے اور یہ فیصلہ بھی وہ خود ہی کرتے تھے کہ کسی وقت انھیں کس دائرہ میں گھومنا ہے۔ بس مارکسزم سے تعلق خاطر کا کھونٹا سب سے مضبوط تھا۔ آخر آخر میں مصوری کے فن میں ان کی دلچسپی خاصی بڑھ گئی تھی میں نے کئی بار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس شعبہ پر با قاعدہ توجہ دے کر کسی خاص موضوع پر بیس پچیس تصویریں بنا دیں تو ان کی نمائش کا اہتمام کیا جائے، لیکن خواہش کے باوجود مجھے اس میں کامیابی نہ ہوسکی کیونکہ یہ حضرت لوگوں کی فرمائش پر تصویریں بناتے اور انھیں بانٹ دیا کرتے تھے۔ اور نمائش وغیرہ کی تجویز سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ شروع شروع میں تو وہ اپنے شوق میں کسی اور کو شریک کرنے کے قائل بھی نہیں تھے کہ کہیں کوئی ان کے کسی کام پر انگشت نمائی نہ کردے۔ لیکن رفتہ رفتہ خاص خاص لوگوں پر کھلنے لگے تھے اور دلچسپی کے ساتھ اپنے جمع کیے ہوئے خزانے دوسروں کو دکھانے پر تیار ہو جاتے تھے۔ آخری دو چار برسوں میں شاعری کی طرف رغبت پیدا ہوگئی تھی۔ اور انھوں نے بہت اچھی نثری نظمیں لکھ ڈالیں تھیں۔ میں اعز کے آرٹسٹک مزاج اور بھرپور فنی صلاحیت کا نہ صرف قائل رہا ہوں بلکہ حتی الامکان ستائش اور توصیف بھی کرتا رہا ہوں۔ لیکن میری ستائش ایک بے ہنر آدمی کی ستائش تھی کہ مصوری وغیرہ کے فن کی بابت کوتاہ علم آدمی ہوں۔ اعز بے شک بہت صاف ستھرے اور نکھرے ہوئے ذوق کے مالک تھے۔ اور چیزوں کو گہرائی میں دیکھنے اور پرکھنے کا ہنر بھی رکھتے تھے۔ لیکن تخلیقی سطح پر ذوق و شوق کے ساتھ فنی اعتبار سے ماہرانہ رہنمائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کے وہ کچھ زیادہ قائل نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے جب مجھے اپنی بعض نظمیں سنائیں تو میں نے حسب معمول خوب داد بھی دی لیکن ساتھ ہی رسمی طور پر یہ بھی کہہ دیا کہ بھئی آپ کی نظموں میں خیال اور جوش و جذبہ کی داد ضرور دی جاسکتی ہے لیکن ان کو شائع کرنے سے قبل کسی استاد شاعر کو

ضرور دکھالینی چاہیے تا کہ فنی سقم اگر ہو تو نکل جائے۔ یہ محض دوستانہ گزارش تھی لیکن اعز نے اس بات کا بھی برا منایا کہنے لگے۔ ''میں نے ایک نقاد کو نظم سنا کر غلطی کی ہے۔'' ہر چند انھوں نے یہ بات ہلکے پھلکے انداز میں ہنستے ہوئے ہی کہی تھی اور میں نے بھی ردعمل کو سرسری طور پر ہی لیا تھا لیکن مجھے گمان ہوا کہ میرا مشورہ انھیں پسند نہ آیا تھا۔ اس کے بعد اصرار پر بھی انھوں نے اپنی کوئی نظم مجھے نہیں سنائی۔

کراچی میں مارکیٹنگ کے شعبے میں انھوں نے اپنے قدم بہت مضبوطی سے جما لیے تھے اور ان کے سامنے ترقی کی راہیں تیزی سے کھلتی چلی گئی تھیں۔ غالباً سن باسٹھ میں میری چھوٹی بہن صغیر فاطمہ کے لیے اعز کا رشتہ آیا تھا۔ تجویز میں اعزاز، تنویر اور دوسرے رشتہ داروں کی مشاورت یقیناً شامل رہی ہوگی لیکن اس معاملے میں خود اعز بھی بہت پر جوش تھے۔ اس عرصے میں انھوں نے ابا جی سے بھی دوستی گانٹھ لی تھی۔ ہمارے ووٹ کو تو وہ گویا اپنا حق سمجھتے ہی تھے۔ چنانچہ کسی جانب سے رو کاوٹ کا احتمال ہی نہ تھا۔ چنانچہ 22 نومبر 1963ء کو ان کی شادی صغیر سے ہوگئی۔ (یعنی ہمارے ولیمے والے دن) ان کی برات میں کراچی سے بوگی بھر کے مہمان آئے تھے جن میں کراچی اور حیدر آباد کے کئی ترقی پسند دوست، اسٹوڈنٹس لیڈر سیاسی ورکرز اور مزدور رہنما بھی شامل تھے۔ شادی کے بعد ابتدائی چند برس کراچی میں قیام رہا اور جب وہ سندھ کے انچارج ہو گئے تو حیدر آباد میں رہائش ہوگئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ملازمت کے بہتر مواقع حاصل ہو جانے کے باوجود اعز کچھ نہ کچھ سیاسی اور تہذیبی سرگرمیاں بھی جاری رکھتے تھے، چنانچہ اسی زمانے میں یوم مخدوم محی الدین کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا تھا۔ جس میں فیض احمد فیض، جمال الدین بخاری وغیرہ کے علاوہ مغربی پاکستان کے منتخب نمائندہ شاعروں اور ادیبوں نے شرکت کی تھی۔ گویا اس طرح بائیں بازو کی سرگرمیوں میں وہ اپنا حصہ ڈالتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایجنسیوں کی فہرست میں بھی ان کا نام ہمیشہ نمایاں طور پر موجود رہا، یہاں تک کہ بنگلہ دیش کے قیام کے نتیجے میں مغربی پاکستان میں جو پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو یہ حضرت بھی مارشل لائی حکومت کی خصوصی توجہ کے شکار ہو گئے اور پاکستان کے خلاف پوسٹر چھاپنے کے الزام میں قید کر دیے گئے۔ اعزاز پہلے ہی داخل زنداں تھے۔ چنانچہ مجھے اور چھوٹے بھائی انصار کو سکھر سے حیدر آباد ان کی پیشیاں بھگتانے آنا پڑتا تھا۔ آخر اس کیس کا حشر بھی وہی ہوا جو اس قسم کے اکثر مقدموں کا ہوا کرتا ہے یعنی سیاسی مطلع صاف ہوتے ہی اسیران سیاست رہا کر دیے جاتے ہیں سو چند ماہ بعد یہ بھی باہر آ گئے ہر چند اس موقع پر ملازمت کے باب میں تشویش ناک رخنہ پیدا ہو گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے بہت جلد بہتر انداز میں اس کی تلافی ہوگئی تھی۔ اور اس بار پھر ان کا پاؤں نسبتاً زیادہ اونچی

دستار فضیلت پر پڑا تھا۔ اور وہ عملاً پورے مغربی پاکستان کے مارکیٹ انچارج میں ہو کر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ جہاں کم و بیش دس برس خوب عیش و آرام سے گزارے تھے۔

میرا چھوٹا بھائی سیّد ظفر الحق ان دنوں لاہور ہی میں آباد تھا، اور وہاں ایک بینک میں اچھی خاصی پوزیشن پر فائز تھا۔ چنانچہ ان کو وہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہ ہوا تھا۔ بلکہ تھوڑے ہی عرصے میں خود انھوں نے اپنا بھی ایک بہت فعال حلقہ قائم کر لیا تھا۔ لاہور میں ان کی دلچسپی کے سامان بھی کم نہ تھے۔ آثار قدیمہ کا شعبہ ہی کیا کم تھا کہ آرٹ اور شعر و ادب کا ماحول بھی وہاں زیادہ پر رونق تھا، چنانچہ اس زمانے میں اعز کی طبیعت میں بھی خاص جوش اور ترنگ کی کیفیت محسوس ہوتی تھی۔ پنجاب کے قیام کے دوران انھیں لمبے لمبے دورے بھی کرنے پڑتے تھے جو بالعموم وہ اپنی ہی گاڑی میں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک صبح لاہور، گوجرانوالہ ہائی وے پر ان کی کار کا زبردست ایکسیڈنٹ بھی ہوا جس میں ایک ٹانگ میں شدید ضرب آئی تھی، آپریشن کے ذریعہ اسٹیل کی راڈ پاؤں میں ڈالی گئی تھی پھر بھی انھیں کئی ماہ بیساکھیوں کے سہارے گزارا کرنا پڑا تھا۔ یہ ذاتی زندگی میں پہلا شدید دھچکا تھا مگر اسے بھی انھوں نے اپنی فعالیت پر اثر انداز نہ ہونے دیا تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، اعز کے مزاج میں دھوپ چھاؤں کی کیفیت غالب تھی۔ ایک طرف وہ بڑے مجلسی آدمی تھے، جن لوگوں سے ان کا مزاج مل جاتا۔ اُن سے بغیر کسی عذر اور تکلف فوراً شیر و شکر ہو جاتے۔ اس صورت میں دوستانہ گپ شپ، دعوتیں سیر و تفریح کے سارے پروگرام مشترکہ بنتے تھے۔ اعز ہمیشہ اچھے کھانے کے شوقین رہے تھے اور صغیرا اچھے کھانے پکانے کی ماہر۔ چنانچہ اُن کے ہاں اکثر کسی نہ کسی دعوت کا اہتمام رہتا تھا۔ لاہور میں دس سالہ قیام کا زمانہ اعز اور ان کے خاندان کی زندگی کا نہایت پر مسرت اور فارغ البالی کا دور تھا جسے انھوں نے جی بھر کر انجوائے کیا۔ انھیں پنجاب کے شہر شہر اور قصبے قصبے کے دورے کرنے ہوتے تھے چنانچہ ہر جگہ ان کے جاننے والوں کے حلقے قائم ہو گئے تھے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی انھوں نے خاص توجہ صرف کی اور بچوں نے بھی اس سلسلہ میں انھیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ بچوں کے لئے اعز بہت شفیق باپ تھے مگر ڈسپلن کے معاملے میں کسی قسم کی رو رعایت کے قائل نہ تھے۔ بچے ان کی نگاہ کو خوب پہچانتے تھے۔ اور حسب مقدور ان کی مرضی اور منشا کو اپنے سامنے رکھتے تھے۔ بڑے بچے لاہور ہی کے قیام کے دوران تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ جب کہ چھوٹے بچے عمر کے مطابق تعلیمی سلسلے کو مکمل کرتے رہے اس عرصے

میں وہ دو چار ماہ کے بعد کراچی اور سندھ کا چکر بھی لگا لیتے تھے۔ اور اس طرح قدیم رابطوں کو بحال رکھنے کے جتن کرتے رہتے تھے۔

اپنے بھانجے اشفاق الرحمٰن سے بڑی بیٹی عظمیٰ کی شادی کرنے کے بعد اعز اور صغیر کو خاصا اطمینان ہوگیا تھا۔ لیکن سچی بات ہے کہ اب ان کا دل لاہور سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔ خاص طور پر میرے چھوٹے بھائی ظفر کے بیرونِ ملک چلے جانے کے بعد لاہور میں ان کی دلچسپی ختم ہوگئی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ملازمت سے طویل چھٹی لی اور کراچی آ گئے۔ بعد میں تو ان کا ٹرانسفر ہی کراچی کا ہوگیا تھا۔

کراچی آنے کے بعد بھی ان کے معمولات کم و بیش وہی رہے تھے جو پہلے تھے۔ اکثر شاموں کو گاڑی میں بھر کر فیملی کو کسی نہ کسی عزیز رشتہ دار یا دوست کے ہاں دھاوا بولتے اور پھر گھومتے گھامتے رات گئے گھر لوٹتے تھے۔ چھٹی کا دن پرانے نظریاتی دوستوں اور کامریڈوں کی خیر و عافیت معلوم کرنے میں گزر جاتا تھا۔ ان کے کراچی ہی کے قیام کے دوران میرے بھائی سیّد ظفر الحق کا جو افریقی ملک زمبیا میں ملازم تھے کسی حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ اور ان کی بیگم میت لے کر کراچی میں میرے گھر آ ئیں۔ یوں تو یہ سانحہ ہم سب ہی کے لیے نہایت اچانک اور دردناک تھا، لیکن صغیر اور اعز دونوں نے اس حادثے کا بہت زیادہ اثر لیا تھا اور بھائی کی لاش دیکھتے ہی صغیر پر فالج کا دورہ پڑ گیا، جس کے زیر اثر وہ بستر سے جا لگی تھی۔ صغیر کی علالت کا دورانیہ کئی برسوں پر محیط رہا اور بالآخر وہ اسی علالت میں وفات کرگئی تھی۔

اس پوری مدت میں اعز بھی یکسر تبدیل ہوکر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ اندر سے بالکل ہی بیٹھ گئے ہوں۔ سارے شوق، سب مشغلے ایک طرف جا پڑے تھے۔ بیشتر وقت صغیر کی تیمارداری اور بچوں کی دل دہی میں گزرتا تھا۔ گھومنا پھرنا تک موقوف تھا۔ ویسے تو اعز شروع ہی سے گھریلو (Domistec) مزاج کے آدمی تھے۔ بال بچوں کے بغیر ان کا گزارا ممکن ہی نہ تھا وہ بھی ان کی دلچسپیوں میں برابر شریک رہتے تھے۔ صغیر کے انتقال کے کے بعد ان کے مزاج کا سارا سیلانی پن غائب ہوگیا تھا۔ اور گھنٹوں تنہا بیٹھے بیٹھے ہی گزار دیا کرتے تھے۔ لکھنے پڑھنے میں شروع ہی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، جو انھیں مصروف رکھنے کو کافی تھے، کبھی کبھار موڈ بنتا تو کسی تصویر کا خاکہ بنانے لگتے اور کوئی نہ کوئی فن پارا بنا لیتے۔ اس زمانے میں باہر گھومنا پھرنا بھی کم و بیش ترک کر چکے تھے۔ لیکن آدمی زندگی سے خواہ کتنا ہی بھاگے زندگی آپ کو کب بھاگنے دیتی ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ان پر سے یاسیت کا غبار چھٹنے لگا اور وہ زندگی کے معمولات میں دلچسپی لینے لگے۔ بڑے بچوں کی

شادی کے بعد کراچی ہی میں تین تین سمدھیانے ہو گئے تھے۔تو کوئی نہ کوئی فن پارا بنا ہی لیتے تھے۔

اسی زمانے میں کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کی گولڈن جوبلی (1996) کانفرنس کراچی میں مقصد ہوئی۔تو اعزاس کی مجلس انتظامیہ کے سیکرٹری مقرر ہوئے تھے جسے وہ اپنے لیے ایک بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔

اعز پانچ بہنوں کے بہت چہیتے بھائی تھے اور وہ سب ان پر واری واری جاتی تھیں۔ یہ بھی ہر اک سے خلوص اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ہر ہفتے کسی نہ کسی بہن کے ہاں ضرور ہی چکر لگا آئیں۔اسی طرح وہ دور دراز کے عزیزوں کی خیر گیری میں بھی بہت چوکس رہا کرتے تھے۔ان کی زندگی کا سب سے اندوہ ناک صدمہ بڑے داماد اشفاق الرحمٰن کی بے وقت اور ناگہانی موت تھی۔جس نے انھیں اندر سے توڑ دیا تھا۔اشفاق کے انتقال کے بعد انھوں نے بیٹی اور اس کے بچوں کو اپنے سایہ عانت میں سمیٹ لیا تھا۔اور وہ اب بھی ان ہی کے خاندان کے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ ان کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ اعز کے سب بچے مل جل کر رہتے ہیں۔اور ان کے گھر میں یگانگت کا ماحول رہتا ہے۔ان کی زندگی میں جو دو بہوئیں بیاہ کر آئیں وہ خوبی تقدیر سے خود بہت سمجھدار، پڑھی لکھی سلیقہ شعار ہیں انھوں نے ابتدا ہی میں اپنے سسر کے مزاج اور انداز کو سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ ہمیشہ ان کی مرضی کے مطابق ہی گھر کے معاملات چلائے ہیں۔ان کے کھانے پینے اور دوا دارو کے اوقات اور اہتمام کا خاص طور پر خیال رکھا گیا۔ یہاں تک کہ گھر کے سب لوگ جانتے تھے کہ انھیں ٹی وی کے کون کون سے پروگرام اچھے لگتے ہیں چنانچہ سب کی خواہش ہوتی تھی کہ اس معاملے میں بھی ان ہی کی پسند کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔اور خوشی کی بات ہے کہ آج بھی معاملات اسی طرح چلتے ہیں۔جس طرح اعز کی زندگی میں چلا کرتے تھے۔اعز نہایت حساس طبیعت کے مالک اور پیار و محبت کے پیکر تھے۔انھوں نے اپنے آپ کو ایک خاص ڈسپلن کا پابند بنا رکھا تھا اور آخر عمر تک اس ڈسپلن کی نہ صرف خود پابندی کی ہے بلکہ گھر بھر کو اس کا عادی بنا دیا تھا، جس کسی شخص سے ملتے نہایت خلوص محبت اور تپاک سے ملتے تھے اور دوسروں سے بھی ویسے ہی رویے کی توقع رکھتے تھے۔دکھاوا یا خواہ مخواہ ہی کے نام جھام کے وہ ہر گز قائل نہ تھے۔چنانچہ ان کے گزر جانے کے بعد بھی ان کی شخصیت کی خوشبو آس پاس مہکتی ہے۔

سیّد مظہر جمیل

رفیقانِ صدق و صفا

اعز عزیزی
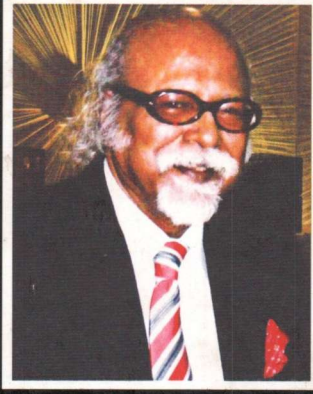
کامریڈ عزیزی

(06-02-1938 ___ 22-2-2013)

انسان سے ہر چیز چھینی جا سکتی ہے لیکن اُس سے خواب دیکھنے کا عمل نہیں چھینا جا سکتا۔ حالات موافق ہوں یا مخالف، انسان خواب دیکھتا ہے لیکن رنگ بھرنے کی ہمت اُسے عطا ہوتی ہے جو اُن خوابوں کو حقیقت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ انسان قطعاً ضروری نہیں کہ کرۂ ارض کے کسی حصے پر بسنے والا مشہور لیڈر، شاعر، ادیب یا حکمران ہو، یہ کوئی عام شخص بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ وہی انسانی سماج کو آگے بڑھانے کی بنیادی حرکی قوت ہوتا ہے۔

اعز عزیزی مرحوم ایک ایسے ہی انسان تھے۔ عزم پہاڑ جیسا بلند اور عمل تیشہ کو مسلسل حرکت میں رکھنا۔ ایثار ایسا کہ وہ قرض اُتارے جو واجب بھی نہیں تھے۔ ذات کی نفی کر کے تحریک کو آگے بڑھانے کا ولولہ کوئی ان سے سیکھے۔ اس تحریک نے بڑے ناموں کے ساتھ جو گمنام سپاہی پیدا کیے اعز عزیزی اُن میں ایک بڑا نام ہے۔ زیرِ نظر کتاب تصور کو عمل میں ڈھالنے کی گواہی ہے۔

سانجھ
سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com
ISBN: 978-969-593-201-8

پڙهندڙ نسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندڙ نسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان ڪٽي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پڙهندڙ نَسل (پَ نَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعوىٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي کي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جهڙيءَ طرح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ کا خُصوصي ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَ پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَ سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَ کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڌِ کان وَڌِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکَڪَن، ڇپائيندڙن ۽ ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، چاڻ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ، پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سينې کي بَمن، گولين ۽ بارودَ جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.
... ...
جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛
... ...
ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........
... ...
هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اڄاڻائي کي پاڻ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ ”هاڻي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ بين

ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چوءِ چالاءِ ۽ ڪينئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻَ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪِي پائي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)